PakistaniPoint
Aik Rabta Apnon Sey

متاعِ شام و سحر

کرم حیدری

متاعِ شام و سحر

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

کرم حیدری

مکتبہ المحمود ۹ - بی سیٹلائٹ ٹاؤن
راولپنڈی

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول : ۱۹۹۳ء : ۱۰۰۰ ہزار
کوڈ نمبر : جی بی او آر / پی ۵۴۵ / ۱۰۰۰
مطبع : منزا پرنٹنگ کارپوریشن ' اسلام آباد

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۸	عزم و عمل	۴۷
۱۹	اے وطن ۔ اے وطن	۴۹
۲۰	مرگ انبوہ	۵۱
۲۱	دھواں پھیل گیا	۵۲
۲۲	ظالم ہوائیں	۵۳
۲۳	وقت کے رخ کو بدلنا ہو گا	۵۴
۲۴	تکمیل داستاں تک	۵۶
۲۵	رنگ سفر بھی دیکھ لیا	۵۸
۲۶	۱۴ اگست	۵۹
۲۷	حقیقت اور افسانہ	۶۲
۲۸	اندھیری روشنیاں	۶۴
۲۹	سہانے بادل	۶۷
۳۰	خون شہیداں	۶۹
۳۱	ہمارا قائد	۷۳
۳۲	خون دل	۷۴
۳۳	الفاظ کا مسیحا	۸۰
۳۴	زندہ ہیں ہم زندہ ہیں	۸۳
۳۵	آج کے دن	۸۵
۳۶	مشعل تاباں	۸۷

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

نشان راہ

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	ابتدائیہ	۱۱
۲	دعائیہ	۱۵
۳	ہر سایہ گریزاں ہو گا	۱۷
۴	روشنی	۱۹
۵	اے وطن، پیارے وطن، پاک وطن	۲۱
۶	ضرب گراں	۲۲
۷	حسن مستعار	۲۴
۸	فضائے وطن	۲۶
۹	نیا دور	۲۸
۱۰	میخانہ شوق	۲۹
۱۱	صدائے حق	۳۰
۱۲	چلی گلشن میں پھر باد بہاری	۳۱
۱۳	جشن بہاراں	۳۳
۱۴	روشنی جاگ اٹھی	۳۵
۱۵	سوئے منزل	۳۷
۱۶	نئی منزلیں	۳۹
۱۷	لو سحر آئی	۴۶

وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

غزلیں

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	زخم دل کا اگرچہ گہرا ہے	۹۱
۲	عشق کی دنیا میں کیا ہم کو سوغاتیں ملیں	۹۲
۳	جو کچھ مرے خیال کی پہنائیوں میں ہے	۹۴
۴	سنبھل گئے ہیں جہاں میں بیمار کیسے کیسے	۹۶
۵	کبھی بنی نہ بنائی فریب کاروں سے	۹۹
۶	یوں نہ لے فصل گل گزر جانا	۹۸
۷	سخن کے آئنوں کو پاش پاش کرتے رہے	۱۰۰
۸	خود کو جان جہاں سمجھتا ہے	۱۰۲
۹	شرر فشاں مرے سینے کا گھاؤ ایسا ہے	۱۰۳
۱۰	زمانہ گذرا ہے دل میں یہ آرزو کرتے ہیں	۱۰۵
۱۱	جو ہے نصیب میں اس کا سوال کیا کرنا	۱۰۷
۱۲	چند کرنوں کو ہی کیوں روز تھرکتا دیکھوں	۱۰۹
۱۳	ہمارا کام تو تھا سیپیوں میں گھر کرنا	۱۱۱
۱۴	اداس لمحوں میں آخر وہ مل گیا تھا مجھے	۱۱۳
۱۵	ہم اگر داستاں سرا ہوتے	۱۱۵
۱۶	آنکھوں نے الٹ ڈالے سب دل کے نقاب آخر	۱۱۶
۱۷	اب مجھے غم کے اندھیروں سے بچائے رکھنا	۱۱۸
[illegible]	[illegible]	[illegible]

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۹	تو چاند مانگے ہے گھر میں چراغ بھی نہ رہا	۱۲۲
۲۰	نہ تاج دیکھا ہے ہم نے نہ تخت دیکھا ہے	۱۲۳
۲۱	رفتہ رفتہ جب لہو میں آنچ کم ہو جائے گی	۱۲۵
۲۲	لو بھی قاتل سے لگائے رکھنا	۱۲۷
۲۳	کب یہاں قافلہ باد بہاری ٹھہرا	۱۲۸
۲۴	یہ قدر خواہش دل ہو سکی نہ بات اس کی	۱۳۰
۲۵	یوں نکھر کے ابھرا ہے رنگ داستاں اپنا	۱۳۱
۲۶	اب درد خریدا ہے تو پھر ذکر دوا کیا	۱۳۳
۲۷	زمانے لمحوں میں ڈھل کے ہوتے رہے فسانے	۱۳۵
۲۸	بستیاں دور بسانے والے	۱۳۶
۲۹	محبت بے سروساماں نہیں ہے	۱۳۷
۳۰	چہرہ اس کا ہرے بھرے بستانوں سا	۱۳۸
۳۱	تلاش آب و ہوائے بہار کیا کرتے	۱۳۹
۳۲	تعصبات نے اس طرح مجھ کو گھیرا ہے	۱۴۱
۳۳	عمر ہے جنگل ہم ہیں شکار اور ظالم وقت شکاری ہے	۱۴۲
۳۴	معرکے راہ تمنا کے بلا خیز رہے	۱۴۴
۳۵	ہم سا کوئی کب ہو گا زخموں کی طرح جس نے ہونٹوں کو سیا ہو گا	۱۴۵
۳۶	میں کب سے دل ہی میں تم کو چھپائے بیٹھا ہوں	۱۴۶
۳۷	کوئی بھی نالہ کسی پر اثر نہیں کرتا	۱۴۸

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۳۹	زخم تو چار دن میں بھر جائیں	۱۵۲
۴۰	شب ستارے دیکھنا دن راہ فردا دیکھنا	۱۵۳
۴۱	زباں پہ میری جو حرف سوال آجاتا	۱۵۵
۴۲	قفس کو توڑا تمنائے آشیاں سے گئے	۱۵۶
۴۳	وہی ہے عشق وہی اس کی طبع شور انگیز	۱۵۷
۴۴	اب بہار و خزاں سے کیا لینا	۱۵۸
۴۵	جو مزاج بن آدم ذرا استوار ہوتا	۱۵۹
۴۶	لخت لخت	۱۶۱
۴۷	قطعات	

ابتدائی دور کی منظومات

۱	رات	۱۷۷
۲	اے دیدہ خوننابہ بار	۱۸۰
۳	تلوار	۱۸۲
۴	بہار	۱۸۵
۵	انفعال	۱۸۹
۶	تیاتر ۔ دوسری جنگ عظیم کے کردار	۱۹۱

ا۔ ساحر انگلیس ب۔ دیوانہ آلمان ج۔ مزدک ثانی۔ د۔ باربد سیزر ر۔ ترک دانا۔ س۔ لعبت چین۔ ص۔ زرگر۔ ط۔ فرنگی مشرق۔ ع۔ مہاتما۔ ف۔ مرد مومن۔

وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

شاعری قدرت کی عطا کردہ ودیعت ہے کوئی شخص جو اس قدرتی ودیعت کا حامل نہ ہو اپنی کوششوں سے بہت بڑا عالم تو بن سکتا ہے لیکن شاعر بننا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری قومی تاریخ میں بے شمار ایسی ہستیاں گزری ہیں جن کا علم و فضل ان کے لئے سرمایۂ افتخار ہے مگر جہاں تک شاعری کا تعلق ہے وہ اس سے قطعاً بیگانہ رہے۔

مجھے قدرت کے اس عطیے کا علم اس دور ہی میں ہو گیا تھا جب میں ہائی سکول کا طالب علم تھا۔ اُسی زمانے میں اشعار میری زبان پر وارد ہونا شروع ہو گئے تھے شاعری میں مجھے تلمیذ الرحمٰن ہونے کا فخر حاصل ہوا کیونکہ جہاں میں تھا وہاں شاعری ایک جنسِ کمیاب تھی اور کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اس فن میں میرا رہنما بن سکتا۔

چنانچہ شاعری از خود میرا شعار بن گئی اور میں اپنی فطری قوت کی بنا پر اس میدان میں آگے بڑھنے لگا۔ ۱۹۳۱ء میں کہ میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ میری ایک مختصر سی نظم روزنامہ سیاست لاہور کے جمعہ ایڈیشن میں مدیر کے مختصر تو صیفی نوٹ اور "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ" کے دعائیہ کلمات کے ساتھ شائع ہوئی۔ عنوان کے طور پر اُسی نظم کا ایک مصرعہ دیا گیا تھا۔ "قربِ خدا جو چاہے تو بندوں سے پیار کر" پورا شعر اس طرح سے تھا۔

عابد ہو لاکھ پر یہ عبادت ہے نا تمام
قربِ خدا جو چاہیے تو بندوں سے پیار کر

فطرت کے عطیے کے متعلق آگاہی کے بعد میں نے شاعری کو اپنا شعار ہی نہیں اپنا شعور بھی بنایا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ شاعری اور میری ذات ایک ہی تخلیق کے دو پہلو ہیں۔ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ میں جو کچھ بھی لکھتا تھا احساس کے اسی شعور میں ڈوب کر لکھتا تھا۔ شعور اور شعار کی ہم آہنگی نے ابتدا

ہی سے میرے فن کو وہ تابانی عطا کی کہ میں ایک نئے ستارے کی صورت میں افقِ ادب پر نمودار ہوا۔ میرا پہلا مجموعہ نظم دوش و فردا ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تو دنیائے ادب میں اس کی نہایت عمدہ انداز میں پذیرائی ہوئی۔ روزنامہ پاکستان ٹائمز میں نیشنلسٹ ورس کے عنوان سے اس پر نہایت خوبصورت تبصرہ شائع ہوا۔

ممتاز شاعر اور نقاد جناب مختار صدیقی نے لکھا۔

"کرم حیدری کی شعری خصوصیات میں ان کا یہ رویہ اور انداز نظر ہی نہیں۔ اُن کی بلند حوصلگی اور رجائیت بھی قابل تحسین ہے اُن کے سے خوبصورت مناظر میں پروان چڑھنے والا اور رہنے والا صاحب احساس شخص خوش فکر ہے تو بھی تعجب کی بات نہیں زندگی کے معاملات اور روزگار کے اعتبارات نے ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ پھر بھی یہ بات اِس مجموعے میں چونکاتی ہے کہ وہ دردمند ضرور ہیں۔ درد پسند نہیں"

ڈاکٹر اسلم قریشی نے اپنے ایک تبصرے میں فرمایا

"دوش و فردا" کے مطالعہ کے بعد وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعہ تحریک آزادی کی ایسی تاریخی دستاویزات کا حامل بھی ہے اور فکر و خیال کے متنوع اظہار کا بے نظیر خزانہ بھی جس میں کرم حیدری کی قادر الکلامی' زبان پر قدرت' اسلوب کی ندرت ابلاغ و اظہار کا ملکہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فن کارانہ کمال کے ساتھ تخیل اور فکر و جذبہ کا حسین امتزاج ہر قاری کو داد و تحسین پر مجبور کرتا ہے"۔

اسی طرح میرے کئی ہم عصر احباب نے میری شاعری کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار فرمایا ہے۔ تاہم تفصیل میں جانے کی بجائے میں اپنے ہم عصر شاعر سید جعفر طاہر کی تبصرے سے چند سطور لے کر اپنے کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ جیسا کہ سب لوگ جانتے ہیں جعفر طاہر سے خراج تحسین حاصل کرنا کسی عام شاعر کے بس کی بات نہیں وہ اپنے ایک تبصرے میں جو ماہنامہ اوراق میں شائع ہوا لکھتے ہیں۔

"کرم حیدری اپنے زمانے کے ایک شدید کرب میں مبتلا ہونے کے باوجود ایک حساس ناظر اور زندگی کے دیانت دار ناقد کی حیثیت سے ابھرا ہے دوش و فردا کی

نظمیں وقت مرت، قرب، بُعد، تعمیر و تقریب، عرفان ذات اور شعور ذات کے عمل کو پیش کرتی ہیں۔ کرم حیدری آویزش ذات کا شاعر نہیں اس کے یہاں کوئی complexes نہیں اس کے یہاں واضح منزل اور ایک روشن و تابناک نقطہ نظر ہے جو اس کی داخلی اور اندرونی قوت کا پروردہ ہے۔ اس پر ابتذال کے داغ، تتبّع کے دھبّے اور تقلید کے چھینٹے کہیں بھی نہیں اس کے کلام میں سادہ رخان کہسار کا حسن ان کی بے تکلف زندگی کا جمال ان کا بے لوث خلوص اور ان کا عزم و استقلال جھلکتا ہے"۔

ارباب سخن کی طرف سے اس پرخلوص پذیرائی پر اگر میں کہوں کہ "شادم از زندگی خویش کہ کارے کروم" تو بے جانہ ہو گا

کرم حیدری

قائد اعظم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعائیہ

یارب چراغِ فکر بھی شمعِ نظر بھی دے
دل جس سے زندہ تر ہو وہ سوزِ جگر بھی دے

پرواز کا جنوں جو دیا بال و پر بھی دے
پہنچے جو ماورائے فلک وہ نظر بھی دے

دل کے صدف میں درد کا رنگین گہر بھی دے
جاں کے چمن کو حاصلِ برق و شرر بھی دے

میں بے ہنر ہوں مجھ کو دعا کا ہنر بھی دے
میری دعا کو اپنے کرم سے اثر بھی دے

تجھ کو جو پا سکوں تو میں خود کو بھی پا سکوں
اپنا پتہ بھی دے مجھے میری خبر بھی دے

اک عمر سے ہوں وقفِ تب و تابِ آرزو
میری ریاضتوں کا مجھے کچھ ثمر بھی دے

کب تک رہوں گا بارگہِ مصطفیٰؐ سے دُور
زادِ سفر دیا ہے تو اِذنِ سفر بھی دے

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ
PAKISTANIPOINT
ایک رابطہ اپنوں سے

اب میں ہوں اور معرکہ تکمیلِ ذات کا
تیغِ انا جو دی تو رضا کی سپر بھی دے

روشن ہوا نگہ سے تری دل کا آئنہ
عکس اس میں اپنا اے مرے آئینہ گر بھی دے

اپنے کرمؔ کو شیفتہ کر اپنی ذات کا
حسنِ وفا بھی دے اسے حسنِ نظر بھی دے

☆ اس التجا کے تھوڑے ہی عرصے بعد حج کی سعادت نصیب ہوئی ۱۹۸۴ء

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ہر سایہ گریزاں ہو گا

اب کے دل کہتا ہے وہ جوشِ بہاراں ہو گا
رشکِ فردوسِ بریں صحنِ گلستاں ہو گا

حسن ہر خاک کے ذرے سے نمایاں ہو گا
دشت آئینۂ سیمائے گلستاں ہو گا

پھول ساون کی گھٹاؤں کی طرح برسیں گے
ہر کسی کو گلۂ تنگیٔ داماں ہو گا

ہر نظر شمعِ شبستانِ محبت ہو گی
ہر دہن بزمِ طرب میں گلِ خنداں ہو گا

ہو گی اس طرح سے آراستگیٔ بزمِ جمال
دیدۂ اہلِ حسد اور بھی حیراں ہو گا

آفتابِ سحرِ نو کی ہے آمد آمد
پردۂ ذہن سے ہر سایہ گریزاں ہو گا

مجھ سے ہاتف نے کہا ہے کہ وہ دن دور نہیں
جب نیا دور نیا رنگِ گلستاں ہو گا

ایک مدت سے پریشاں تھے عنادل اپنے
اب خدا چاہے تو صیاد پریشاں ہو گا

عزمِ نو لے کے جو اٹھے ہیں جیالے انساں
اب کوئی دن میں شکستہ درِ زنداں ہو گا

حق کی آواز ہوئی شعلۂ سوزاں آخر
راکھ اس شعلے سے باطل کا نیستاں ہو گا

روشنی ابھری ہے ظلمات کے پردوں سے کریمؔ
پھر افق صورتِ خورشید درخشاں ہو گا

۱۹۶۴ء

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

روشنی

برف زاروں کی آغوش میں زندگی بارہا گم ہوئی بارہا کھو گئی
یخ کی سنگیں سلوں کے تلے دب گئی، نیم مدہوش سی ہو گئی، سو گئی
اس میں کوئی حرارت نہ حرکت رہی
مٹ گئے ولولے، لٹ گئے حوصلے
وقت ہر بار ہنس ہنس کے کہتا رہا اب کے یہ حشر تک منجمد ہو گئی

بارہا موسمِ گل ہوا رائگاں، بارہا چھا گئی گلستاں پر خزاں
پھول، غنچے، شگوفے ملے خاک میں، مٹ گیا سبزہ و گل کا نام و نشاں
بلبلیں اُڑ گئیں پتیوں کی طرح
گیت مُرجھا گئے کونپلوں کی طرح
ذہن رو رو کے فریاد کرتے رہے اب بہاریں کہاں اب بہاریں کہاں

ظلمتیں کشورِ ذہن و ادراک پر اکثر آ آ کے جھنڈے اڑاتی رہیں
چار سو پھیلتی بڑھتی جاتی رہیں، اپنی ہیبت کا سکہ بٹھاتی رہیں
جسم کی جلوتوں پر بکھرتی رہیں
روح کی خلوتوں میں اترتی رہیں
جن چراغوں میں تھی روشنی کی دمک ان کو دامن سے اپنے بجھاتی رہیں

ظلمتوں کے عقب میں مگر پے بہ پے روشنی کے منارے ابھرتے رہے
چاند سورج جو نظروں سے اوجھل ہوئے ضوبداماں ستارے ابھرتے رہے
روشنی زندگی کو جگاتی رہی
اس کے شانوں کو پیہم ہلاتی رہی
تیرہ و تار مٹی کے ذرات سے رنگ و خوشبو کے دھارے اُبھرتے رہے

جب بھی چمکا ہے سورج افق پر کوئی اس کی ضوہر نظر کو رِجھانے لگی
برف زاروں کے تودے پگھلنے لگے، زندگی جاگ اٹھی مسکرانے لگی
پھول کھلنے شگوفے چٹکنے لگے
بام و در آرزو کے مہکنے لگے
جلوتوں خلوتوں کے اندھیرے چھٹے روشنی جسم و جاں میں در آنے لگی

ہے ازل سے زمانے کی گردش یونہی، روشنی، تیرگی--- تیرگی، روشنی
روشنی ہاؤ ہو، جستجو، زندگی --- تیرگی بے کسی، بے بسی، خامشی
روشنی عزم و ہمت کی جاگیر ہے
تیرگی کم نگاہی کی تقدیر ہے
جن کے دم سے زمانے میں ہو روشنی، ہے اُنہی کے لئے جاوداں زندگی

روشنی کم نہ ہو، دوستو، ہمدمو! عزم و ہمت کی شمعیں اٹھائے چلو
اپنے افکار کی ضو بڑھائے چلو، اپنے کردار کو جگمگائے چلو
بزمِ امکاں کی تنویر ہے آدمی
اس کے دم سے ازل تا ابد روشنی
مشعلِ دیدہ و دل جلائے چلو یوں ازل کو ابد سے ملائے چلو

۱۹۶۵ء

اے وطن پیارے وطن پاک وطن

تو دل افروز بہاروں کا ترو تازہ چمن تو مہکتے ہوئے پھولوں کا سہانا گلشن
تو نوازیز عنادل کا بہاریں مسکن رنگ و آہنگ سے معمور ترے کوہ و دمن
اے وطن پیارے وطن پاک وطن

پیکرِ شوکت و عظمت ہے ترا ہر کہسار تیرے دریاؤں پہ ہیں کوثرو تسنیم نثار
تیرے میدانوں میں ہر سمت کھلے ہیں گلزار گوشہ گوشہ ترا شاداب ہے مانندِ چمن
اے وطن پیارے وطن پاک وطن

تیری مٹی میں ہے سرشار امنگوں کا خمیر تیرے پانی کی ہے بے لوث محبت تاثیر
عکسِ خورشید وفا تیری فضا کی تنویر مسکنِ صدق و صفا تیری ہوا کا دامن
اے وطن پیارے وطن پاک وطن

حسنِ فطرت تیرے ہر گاؤں میں ہر شہر میں ہے آبِ حیواں تری ہر ندی میں ہر نہر میں ہے
تو وہ نوخاستہ گل اس چمنِ دہر میں ہے جس کی خوشبو سے مہک اٹھی ہے دنیائے کہن
اے وطن پیارے وطن پاک وطن

تجھ سے ہے میری تمناؤں کی دُنیا پُرنور عزم ہے میرا قوی میرے ارادے ہیں غیور
میری ہستی میں انا ہے مری مستی میں شعور جاں فزا میرا تخیّل ہے تو شیریں ہے سخن
اے وطن، پیارے وطن، پاک وطن

میرا دل تیری محبت کا ہے جاں بخش دیار میرا سینہ تری حرمت کا ہے سنگیں حصار
میرے محبوب وطن، تجھ پہ اگر جاں ہو نثار میں یہ سمجھوں گا ٹھکانے لگا سرمایۂ تن
اے وطن، پیارے وطن، پاک وطن

۱۹۶۵ء

ضربِ گراں

نگہۂ اہلِ وفا برقِ تپاں ہے کہ نہیں
خرمنِ ظلم و ستم شعلہ چکاں ہے کہ نہیں

دل میں بیدار پھر اک عزمِ جواں ہے کہ نہیں
شوق پھر نغمہ بہ جاں زمزمہ خواں ہے کہ نہیں

بس گئی خونِ شہیدانِ کی جو اِس میں خوشبو
صحنِ گلشن میں صبا رقص کناں ہے کہ نہیں

عشق جس شان سے اترا سرِ میدانِ وغا
باعثِ فخرِ محبت زدگاں ہے کہ نہیں

شہر تا شہر لہو رنگ ہے افسانۂ شوق
داستاں سلسلۂ شرح و بیاں ہے کہ نہیں

جل اٹھے ذہنوں کے طاقوں میں امنگوں کے چراغ
ایک شعلہ سا رگ و پے میں رواں ہے کہ نہیں

کامراں ہے کہ نہیں تیغِ شعاعِ خورشید
سرنگوں ظلمتِ باطل کا نشاں ہے کہ نہیں

تھم گئے کیسے جو یلغار کئے آتے تھے
عزم ذروں کا مگر کوہِ گراں ہے کہ نہیں

پھر ابابیلوں نے فیلوں کو کیا ہے برباد
یہ بھی اک معجزۂ عصرِ رواں ہے کہ نہیں

چند شہبازوں نے طوفانوں کا رخ پھیر دیا
رمز کچھ اس میں بھی اے اہلِ جہاں ہے کہ نہیں

جو ہیں منکر یدِ بیضا کے وہ منکر ہی سہی
سر پہ فرعون کے اک ضربِ گراں ہے کہ نہیں

تھے بہت مشرق و مغرب میں خریدار ان کے
سرد اب رونقِ بازارِ بتاں ہے کہ نہیں

کل جن آنکھوں میں چھلکتی تھی تمرّد کی شراب
آج اُن آنکھوں سے خوں نابہ رواں ہے کہ نہیں

پھر رواں ہیں کہ نہیں قافلے منزل کی طرف
بے اثر سلسلۂ شورِ سگاں ہے کہ نہیں

اُس پہ جو لوگ بھروسا کریں اُن کو حاصل
اب بھی تائیدِ خداوندِ جہاں ہے کہ نہیں

اپنی اِس اُمّتِ عاصی پہ بصد لطف کرمؐ
آج بھی چشمِ محمدؐ نگراں ہے کہ نہیں

حسنِ مستعار

افلاک پہ روشنی کی دھن میں پھرتے ہیں افق افق ستارے
پاتے نہیں لمحہ بھر بھی آرام گردش میں ازل سے ہیں بچارے
لیتے ہیں چمک ذرا ذرا سا لیکن کسی اور کے سہارے

یہ تیرہ دروں یہ سنگ پیکر آوارہ ہیں بے کراں خلا میں
لاکھوں ہیں مگر ہیں بے حقیقت ذرے ہوں جس طرح ہوا میں
دونو کی جو بھیک پر گزر ہو کیا فرق ستارے اور گدا میں

لیکن اسی آسماں پہ سورج کرتا ہے خلا پہ حکمرانی
کتنے ہی جہاں ہیں اس کے ممنون دیتا ہے جنہیں وہ زندگانی
منہ شرم سے ڈھانپتے ہیں تارے ہوتی ہے جب اس کی ضوفشانی

اوروں پہ ہو انحصار جس کا شرمندگی ہے کہ زندگی ہے
مانگا ہوا جو ہو دوسروں سے وہ حسن کہاں ہے بیکسی ہے
جو اپنے ہی دل میں ہو نہ پیدا وہ روشنی کوئی روشنی ہے

محتاج ہو جسم جب کسی کا کیونکر ہو ضمیر اس کا آزاد
شہباز بھی ہو تو کیا اُڑے گا رزق اس کا جو ہو بدستِ صیّاد
محرومِ انا ہوا تو انساں تیشے کے بغیر جیسے فرہاد

انساں ہے وہی جہاں میں زندہ سورج کی طرح جو دن گزارے
روشن ہو سدا ضمیر جس کا ذروں کو بنائے جو ستارے
محتاج وہ خود نہ ہو کسی کا محتاج مگر ہوں اس کے سارے

۱۹۶۶ء

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

فضائے وطن

دل و نظر ہوں اگر عظمت آشنائے وطن
فضائے خلد سے کچھ کم نہیں فضائے وطن

لطیف و دلکش و رنگیں ہے ہر ادائے وطن
لبوں پہ کیوں نہ رہے نغمۂ ثنائے وطن

جو ہوش مند ہیں رکھتے ہیں وہ وطن کا جنوں
جو دیدہ ور ہیں وہ رہتے ہیں مبتلائے وطن

انہی کے دم سے چمن تا چمن مہک ہو گی
نسیمِ خلد ہے جن کے لئے ہوائے وطن

دل و نگاہ سے ملتی ہے اِس کو تابانی
مہ و ستارہ سے بڑھتی نہیں ضیائے وطن

وطن سے قوم ہے اور قوم سے ہمارا وجود
زہے نصیب جو ہم ہو سکیں فدائے وطن

مجھے ہے فرصتِ نظّارۂ بہشت کہاں
مری نگاہ میں ہے حسنِ جانفزائے وطن

قدم قدم پہ جو روشن ہوئے وفا کے چراغ
جوابِ طور ہوئی خاکِ دلربائے وطن

کرمؔ انہی کے لئے ہے ہمارا ہدیۂ دل
لہو سے اپنے بڑھاتے ہیں جو ضیائے وطن

۱۹۶۶ء

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

نیا دور

سائے گہرے تھے بہت شب کی فصیلیں تھیں بلند دل کی بستی میں نہ تھا چاند نہ تارے نہ چراغ
بزمِ ویران تھی سُونے تھے درو بام نظر چین تھا روح کو حاصل نہ طبیعت کو فراغ
خوف تھا اس کے کسی لمحہ چھلک جانے کا زندگی کانپتے ہاتھوں میں تھا لبریز ایاغ

تشنہ لب سوختہ جاں پھرتے تھے ہم خاک بہ سر ایک چشمہ بھی مگر وقت کے صحرا میں نہ تھا
درد کچھ رچ سا گیا تھا رگ و پے میں ایسا جیسے کچھ اس کا مداوا کہیں دنیا میں نہ تھا
ہم تھے اور زیست کی پُرپیچ اندھیری راہیں کوئی جلوہ بھی کسی وادیٔ سینا میں نہ تھا

دفعتہً خاک سے اک پیکرِ خورشید اُبھرا جس نے دو صدیوں کی ظلمت کا فسوں توڑ دیا
عزم کو دانش و حکمت میں سمو کر اس نے حسنِ تدبیر سے تاریخ کا رُخ موڑ دیا
یاس و حرماں کے تھپیڑوں سے جو دل ٹوٹے تھے اس نے اخلاص کی مرہم سے اُنہیں جوڑ دیا
مدتوں جن میں گرفتار رہے قلب و نظر یک بیک ٹوٹ گئیں درد کی وہ زنجیریں
روشنی میں ہوئیں تحلیل فصیلیں شب کی شہر تا شہر اُمڈ آئیں نئی تنویریں
اک نیا دور ہمارے لئے آیا لے کر نئے افکار نئے خواب' نئی تعبیریں

اس نئے دور کے لیکن ہیں تقاضے بھی نئے نئی ہمت ہو نئی طبع کی جولانی بھی
کامرانی کے مراحل کے لئے ہے درکار درد بھی' عزم بھی' اخلاص بھی قربانی بھی
خوب و مرغوب ہے گرچہ ثمر آزادی کا روز و شب نخل کی لازم ہے نگہبانی بھی
ہم نگہباں ہوں تو یہ نخل پھلے پھولے گا
بڑھتے بڑھتے کبھی افلاک کو بھی چھولے گا

۱۹۶۷ء

میخانۂ شوق

وا ہوا پھر درِ مئے خانۂ شوق
دل ہے پھر صورتِ پیمانۂ شوق

شعلۂ فکر و نظر کی ضو سے
پھر تڑپ اٹھّا ہے پروانۂ شوق

کٹ گئی رات سحر آئی ہے
نیند سے جاگا ہے کاشانۂ شوق

اے رفیقانِ سخن
اے نگارانِ چمن
آؤ سب مل کے کریں کوششِ تزئینِ چمن
آؤ تحریر کریں
اک نئے عزم سے افسانۂ شوق
وا ہوا پھر درِ میخانۂ شوق
دل ہے پھر صورتِ پروانۂ شوق
آؤ یاران وطن
پاسداران وطن
آؤ سب مل کے اٹھیں قوتیں یک جا کر کے
اپنے ذہنوں کو نگاہوں کو اکٹھا کر کے
اپنی ہی قوّتِ بازو پہ بھروسا کر کے
آؤ تعمیر کریں
اپنے افکار کی عظمت سے طرب خانۂ شوق
وا ہوا پھر درِ میخانۂ شوق
دل ہے پھر صورتِ پروانۂ شوق

---

۲۳ مارچ ۱۹۶۷ء

صدائے حق

فضا پہ چھایا ہوا تھا مہیب سناٹا سیاہ رات تھی ایسی کہ دل دہلتا تھا
ستارے چہرے چھپائے فلک پہ گم سم تھے زمیں پہ کوئی دیا دور تک نہ جلتا تھا
سسک رہا تھا خلاؤں میں روشنی کا ضمیر افق افق پہ اندھیروں کا حکم چلتا تھا

مگر کہیں سے اچانک صدائے حق کی کرن شبِ سیہ کی فصیلوں کو توڑ کر نکلی
اس اک کرن سے اُمڈتی چلی گئیں کرنیں فضا چمک بھی گئی جن سے گونج بھی اُٹھی
نقیبِ شب کے رکاوٹ بنے رہے لیکن صدا سنورتی گئی روشنی نکھرتی گئی

صدا کی کرنوں سے آخر پگھل گئی شبِ غم جہانِ صدق و صفا میں نئی سحر آئی
اجالے پھیل گئے زندگی کی راہوں میں داؤں نے روشنی روحوں نے تازگی پائی
صدائیں ابھریں تو ٹوٹا طلسمِ خاموشی ہوئی نصیب ہر اک لب کو تابِ گویائی

عجیب شے ہے متاعِ صدائے حق ہمدم کہ اس متاع سے ہے زندگی حسین و جمیل
اِسی سے ملتی ہے معراج آدمیت کو اِسی سے عظمتِ انسانیت کی ہے تکمیل
یہی ہے ضامنِ پاکیزگیٔ قلب و نظر یہی ہے نطقِ پیمبر یہی دمِ جبریل

رہِ وفا میں سفر ہے بہت طویل اپنا
صدائے حق کے علم دوستو اٹھائے چلو

یہی تو ہے جرسِ کاروانِ آزادی
جہانِ شوق میں اپنے قدم بڑھائے چلو

جلا کے شعلے سے اس کے چراغِ حسنِ یقیں
دل و نگاہ کی دنیا کو جگمگائے چلو

۱۹۶۷ء

چلی گلشن میں پھر بادِ بہاری

چلی گلشن میں پھر بادِ بہاری
ملی ہے موسموں کو خوشگواری
اتر آئی خلاؤں سے زمیں پر
مقدر کے فرشتوں کی سواری
مٹی قلب و نظر کی بے قراری
چلی گلشن میں پھر بادِ بہاری

ہوائیں نغمہ و خوشبو درِ آغوش
گھٹائیں مستیاں برسا رہی ہیں
طرب انگیز ہے ماحول ایسا
امنگیں خود بخود لہرا رہی ہیں
دلوں پر وجد کا عالم ہے طاری
چلی گلشن میں پھر بادِ بہاری

لکھی تھیں ہم نے جو اپنے لہو سے
وہ تحریریں نمایاں ہو رہی ہیں
نئی تابانیوں کے جام چھلکے
نئی شمعیں فروزاں ہو رہی ہیں
اندھیروں کو لگے ہیں زخم کاری
چلی گلشن میں پھر بادِ بہاری

ہوئی ہے تیز پھر ہر دل کی دھڑکن
سلگ اٹھی ہے پھر ہر لب پہ آواز

نئی رت ہے نیا دورِ مسرّت
نئے مُطرب نئے نغمے نئے ساز
نیا لہجہ نئی جادونگاری
چلی گلشن میں پھر بادِ بہاری

---

۱۴ اگست ۱۹۶۷ء

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

جشنِ بہاراں

اوجِ افلاک پہ سورج نہ جو کروٹ بدلی
جاگ اٹھے خواب میں ڈوبے ہوئے دشت و کہسار
ہیں افق تابہ افق نغمہ و رنگ و خوشبو
زندگی کے نظر آنے لگے ہر سو آثار
باغ تو باغ تھے ہونا ہی تھا ان کو گلپوش
دشت بھی فیضِ بہاراں سے بنے ہیں گلزار

کوہساروں پہ ہیں زرتار علم سورج کے
برف زاروں پہ جواں دھوپ کی یلغار ہوئی
اپنے احساسِ ہُنرمند کی جولانی سے
ہر کرن تیز ہوئی ایسی کہ تلوار ہوئی
ریزہ ریزہ ہوئیں شیشے کی طرح یخ کی سِلیں
صورتِ اشکِ رواں برف کی دیوار ہوئی

جام چھلکاتے ہوئے اٹھتے ہیں رنگیں بادل
کیف برساتی ہوئی بادِ صبا آتی ہے
جب چہکتے ہیں لچکتی ہوئی شاخوں پہ طیور
ہر شگوفے سے محبت کی صدا آتی ہے
مستیاں بکھری ہیں ہر سمت فضا میں ایسی
لڑکھڑاتی ہوئی گلشن سے ہوا آتی ہے

تازہ اسلوب سے تقدیمِ بہاراں کے لئے
سرو و شمشاد نے پہنے نئے خوش رنگ لباس

لالہ و سبزہ و گل سے یہ عیاں ہوتا ہے
جلوۂ حسن پہ ہے صورتِ معنی کی اساس
ذرے ذرے سے نمایاں ہے ہُنر فطرت کا
پتے پتے میں ہے بیدار نمو کا احساس
دوستو! آؤ کہ یہ جشن منائیں رِل کر
اپنے احساسِ مسرّت کو جگائیں رِل کر

اپریل ۱۹۶۸ء

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

روشنی جاگ اٹھی

تازہ پھر جوشِ فصلِ بہاراں ہوا زندگی کا بیاباں گلَ افشاں ہوا
انجمن انجمن روشنی جاگ اٹھی، بستی بستی میں ایسا چراغاں ہوا

درد پھر تھم گیا، بزم پھر جم گئیں، کٹ گئی گردشیں چھٹ گئیں ظلمتیں
نقش پھر آرزو کا ابھرنے لگا، رنگ امید کا پھر فراواں ہوا

یاس رخصت ہوئی غم روانہ ہوا ختم ناکامیوں کا فسانہ ہوا
زنگ اترا ہے آئینۂ ذہن سے کامرانی کا جوہر نمایاں ہوا

چاند ابھرا ہے اک دودھیا جھیل سے فکر کے زاویئے جگمگانے لگے
مسکرانے لگے سوچ کے بام و در قافلہ پھر ستاروں کا رقصاں ہوا

عزم و اخلاص کی ندیاں ہیں رواں سر زمینِ وطن ہو گئی شاداں
ذرہ ذرہ حریفِ گلستاں ہوا، پتہ پتہ حریمِ بہاراں ہوا

سبز دھانوں کا جوبن سنورنے لگا زرد خوشوں کا سونا نکھرنے لگا
دوستو! دیکھنا بھرتا جائے گا اب جس کی ہمت کا جتنا بھی داماں ہوا

بھوک کھیتوں کی شادابیاں دیکھ کر شرم کی دھند میں منہ چھپائے گئی
اپنے دامن میں خوشیوں کی دولت لئے پھر نمودار مہرِ درخشاں ہوا

محنتوں کے پسینے گرے تھے جہاں، عظمتوں کے وہاں اُگ رہے ہیں نشاں
حوصلے ہیں جواں، ولولے کامراں، پھر فروغِ دل و جاں کا ساماں ہوا

اس کے سینے میں اب جُرأتیں ہیں نئی اس کی نظروں میں اب رفعتیں ہیں نئی
توڑ کر یاس و حرماں کے ہر دام کو طائرِ عزم و ہمت پَر افشاں ہوا

۱۹۶۸ء

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

سُوئے منزل

حسنِ تدبیر و نگہداریٔ آئیں کے طفیل
قافلہ دشت و بیاباں سے نکل آیا ہے
وہ چٹانیں کہ ابو الہول نظر آتی تھیں
ان کو تدبیر کے قدموں سے مسل آیا ہے
ہر مسافر کو یہ احساسِ تفاخر ہے کہ وہ
اپنی قسمت کے نوشتے کو بدل آیا ہے

ظلمتیں وہم و جہالت کی ہوئی ہیں کافور
علم کی روشنی ہر کوچہ و بازار میں ہے
عزمِ تسخیرِ کواکب ہے جواں سینوں میں
اک نیا حوصلہ گفتار میں کردار میں ہے
اس طرح ابھرے ہیں ہم رزم گہِ ہستی میں
ایک ہلچل سی بپا محفلِ اغیار میں ہے

یہ زمینوں کے خزینوں کو اگلتے ہوئے کھیت
یہ گل و مل کو زرو سیم بناتے ہوئے باغ
پھیلتے بڑھتے ہوئے شہروں میں صنعت کا فروغ
شاہراہوں پہ ٹھکتی ہوئی محنت کا فراغ
یہ عمارات، یہ برقاب، یہ دریاؤں پہ بند
ملک و ملّت کے نئے دورِ معیشت کے چراغ

یہ سبھی کچھ کہ جسے دیکھ کے حیراں ہے نظر
کیا تگ و تازِ مسلسل کی حکایات نہیں

جل رہی ہیں جو بہ ہر سمت نئی قندیلیں
کیا یہ مستقبل روشن کی علامات نہیں
ہر نئے موڑ پہ بڑھتی چلی آتی ہے جو ضو
کیا یہ اک عہدِ درخشاں کے نشانات نہیں

ہے مگر قافلہ منزل سے ابھی دُور بہت
ابھی دن رات اسی طرح سفر ہونا ہے
ہر صدف کو ابھی کرنا ہے ہُنر کا اظہار
ابھی ہر قطرۂ نیساں کو گہُر ہونا ہے
باغبانوں کو ابھی رہنا ہے مصروفِ عمل
ہر نئی شاخ کو بڑھنا ہے شجر ہونا ہے
لطفِ آرام کہاں دہر میں محنت کے بغیر
منزلیں ملتی ہیں کب کوشش و ہمت کے بغیر

۱۹۶۸ء

نئی منزلیں

کچھ زیادہ تو زمانہ نہیں گزرا ہے ابھی
یاد ہے خوب ہمیں دور غلامی اپنا
جب ہر اک جذبے کو اغیار کچل دیتے تھے
حرّیت کی جو کہیں پھوٹتی کوئی کونپل
اس کو قدموں میں مسل دیتے تھے
نغمے تاروں سے نکلتے تھے جو ہو ہو کر بے تاب
اُن کو نوحوں میں بدل دیتے تھے
کوئی دھڑکن جو ابھرتی تھی کسی دل میں کبھی
اُس کو پیغامِ اجل دیتے تھے

گردشِ چرخ سے اس ملک میں عالم یہ تھا
پھُول کھلتے تھے مگر
ان کی خوشبوؤں پہ گل چینوں کے پہرے ہوتے
شمعیں جلتی تھیں مگر
رات کے سائے سدا گہرے ہی گہرے ہوتے
دن نکلتا تھا مگر
بام و در قلب و نظر کے نہ سنہرے ہوتے

دن گزرتے ہی رہے اور یہاں صدیوں تک
رُت یہی چھائی رہی
رُت یہی چھائی رہی، زندگی تھرّائی رہی
دل تڑپتے ہی رہے آنکھیں برستی ہی رہیں
غم نے ہر سینے میں اک آگ سی دہکائی رہی

کشتِ افکار پہ اک برق سی لہرائی رہی

اور ناکامئ پیہم کے سبب
رنگۂ اہلِ حرم غیروں سے شرمائی رہی

دفعتہً غیرتِ اسلام نمودار ہوئی
ایک پیکر میں مجسّم ہو کر
دیکھنے میں تو وہ پیکر تھا نحیف اور نزار
تھی مگر اس کی خودی جوہرِ حق کی تلوار
عزم تھا اس کا قوی اور بلند اس کی نظر
استقامت میں نہ تھے اس کے برابر کہسار
وہ سیاست میں صداقت کے اصولوں کا امیں
مردِ بیباک وجری صاحبِ عزم و کردار
برکتیں دونوں کی تھیں ذات میں اس کی شامل
وہ محمدؐ کی فراست وہ علیؓ کی للکار

اس نے شمشیرِ تدبّر سے مسلح ہو کر
وقت کو رام کیا
اپنی ملت کو غلامی سے چھڑا کر اس نے
اک نیا ملک دیا، ایک نیا عزم دیا
نیند صدیوں سے تھی جن پر طاری
اُن کو پھر دیدۂ بیدار کیا
زندگانی کو نئی راہ پہ ڈالا اس نے
ہر مسافر کی نگاہوں کو اجالا اس نے
تھا تصور میں جو اک پیکر رنگیں منظر

اس کے فیضان سے ابھرا وہ حقیقت بن کر

تصورات کا پیکر نہ رہ سکا بے جان
حدودِ شوق نے پایا ہے نام پاکستان
تڑپ نے درد دیا درد نے وطن بخشا
وطن نے کی ہے عطا درد کی نئی پہچان
نیا وطن ہے نئی آرزو امنگ نئی
نئے خیال، نئے ولولے، نئے ارمان
گیا وہ دور کہ تھا دردِ سر غمِ ہستی
کہ اب فسانۂ ہستی کا ہے نیا عنوان
یہ خاک سوز و تپش کی ہے دلنشیں روداد
یہ ملک اہلِ حرم کا ہے جانفزا رومان
بنے گا عالمِ اسلام کا یہی مرکز
یہ خاک دل ہے رگیں مصر و ترکی و ایران

یہ وطن پاک وطن، خرم و شاداب وطن
یہ محبت کے خیابانوں کا رنگیں گلشن
اس میں پنجاب کے کھیتوں کی مہک
اس میں بنگال کے دریاؤں کے گیت
اس میں سرحد کے جیالوں کے رجز
سندھ کے شیر دلوں کی للکار
حوصلہ مند بلوچوں کا شکوہ
گنگناتی ہوئی کشمیر کی سرمست ہوا
لہلہاتے ہوئے سلہٹ کے سہانے باغات
اور چٹگام کی پُرکیف سلونی شامیں

سندھ کی لہریں چٹانوں سے جو ٹکراتی ہیں
دور تک گونجنے لگتی ہے فضا
ڈوب کر نیلم و جہلم میں یہ گونج
اک نئی شان سے مشرق کی طرف بڑھتی ہے
کِھلکِھلا اٹھتے ہیں خوشیوں سے چناب اور راوی
انہی خوشیوں کی مہک
پھیلتی بڑھتی ہوئی راہوں کو چمکاتی ہوئی
بوڑھی گنگا کی رگ و پے میں سما جاتی ہے
یہ محبت کی مہک
یہ مسرت کی مہک
رقص کرتی ہوئی ہر لہر کے ساتھ
آگے، اور آگے نکل جاتی ہے
اور پھر
پدما اور میگھنا کی لہریں بھی ہو کر سرمست
گیت گاتی ہوئی جاتی ہیں سمندر کی طرف
پھر تو ساری ہی فضا گیتوں سے بھر جاتی ہے
گیت اِس پاک وطن کے
گیت اِس جانِ سخن کے
گیت اِس غیرتِ فردوس چمن کے

اے میرے وطن اے میرے وطن

اے میری تمناؤں کے جہاں اے میری امنگوں کے مسکن
اے میری امیدوں کے گلشن اے میرے وطن اے میرے وطن
تو میری وفاؤں کی ہے ضیا، تو میری نواؤں کی دھڑکن

دل تیری حرارت سے زندہ جاں تیری صداقت سے روشن
صہبائے محبت سے تیری، لبریز مرا پیمانۂ فن
تو میرا خلوصِ حسنِ بیاں تو میری متاعِ لطفِ سخن
اے میرے وطن اے میرے وطن

دلکش مترنم جاں پرور نغمے تیرے دریاؤں کے
یہ بہتے دھارے گیتوں کے، یہ کھلتے پھول صداؤں کے
جھونکے سرشار ہواؤں کے میخانے مست گھٹاؤں کے
یہ رکھوالے گلزاروں کے، یہ پنہارے صحراؤں کے
مہکے ہوئے ان کے دم سے ہیں رنگین نقوش فضاؤں کے
خوشبو کی گھلاوٹ دمن دمن، رنگوں کی سجاوٹ چمن چمن
اے میرے وطن اے میرے وطن

اے میرے وطن کیا کیا تجھ پر غم کی نہ یہاں یلغار ہوئی
آلام کی روز اوّل سے کتنی تجھ پر بھرمار ہوئی
گہ اپنے تجھ سے الجھ گئے گہ غیروں کی للکار ہوئی
ہر آگ حسد کی جل اٹھی، ہر برقِ ستم تیار ہوئی
لیکن تیرے فرزندوں کی اب غیرت پھر بیدار ہوئی
گونجی ہے صدا ان شیروں کی صحرا صحرا گلشن گلشن
اے میرے وطن اے میرے وطن

قافلہ اب ہے نئی منزلوں کی سمت رواں
نئی قوّت، نئی ہمّت، نئی تدبیر کے ساتھ
اک نئے سوز نئے سازِ سفر کے ہمراہ
اک نئے جوش، نئے عزم کی تنویر کے ساتھ
جوہری دُور کی قندیل لئے ہاتھوں میں
نئے حالات جہاں کی نئی تفسیر کے ساتھ

یہ نئی منزلیں آبادی و خوشحالی کی
قوم کی شوکت و عظمت کی خوش اقبالی کی
عقل کے دیدۂ بینا سے یہ مستور نہیں
علم کی راہ سے یہ منزلیں کچھ دُور نہیں

آؤ سب مل کے چلیں قوّتیں یک جا کر کے
اپنے اللہ کی نصرت پہ بھروسا کر کے

ایک ہو سب کی لگن
ایک ہو سب کا چلن
ایک ہو سب کی امنگ
ایک ہو سب کی ترنگ

ایک ساتھ اٹھّے نظر ایک ہی ساتھ اٹھیں قدم
ایک ہو سب کا عمل، ایک یقینِ محکم

قوم اگر اپنی شناسا ہو جائے
اس کو اپنے پہ بھروسا ہو جائے
اپنی قوّت سے اگر ہو آگاہ
کیا مقام اس کا ہے اللہ اللہ

بحر غم میں وطن پاک کنارا اپنا
ہم نگہبان ہیں اس کے یہ سہارا اپنا

اپنے پیکر بھی اسی سے ہیں تو جوہر بھی یہی
خاک ہے اس کی مقدر کا ستارا اپنا

رشک کیونکر نہ ہو خود اہل فلک کو ہم پر
چاند کی گود میں چمکا ہے ستارا اپنا

کسی آندھی کسی طوفان سے نہیں بجھ سکتا
آتش عشق سے پھوٹا ہے شرارا اپنا

خود کو جھٹلائیں جو اس خاک کو ہم جھٹلائیں
نقش جس خاک نے دنیا میں ابھارا اپنا

اب یہ برسوں کی نہیں بات ہے صدیوں کی کرم
دور آیا ہے زمانے میں وہ دوبارا اپنا

۱۹۶۸ء

لو سحر آئی

شب کے زنداں کو توڑ کر آئی
لو سحر آئی لو سحر آئی

چاند کی طرح مسکراتی ہوئی پھول کی طرح کِھلکھِلاتی ہوئی
گیت خوشیوں کے گنگناتی ہوئی آسماں سے زمین پر آئی
لو سحر آئی لو سحر آئی

بس گئی ہے مہک فضاؤں میں رس گھُلا ہے نیا صداؤں میں
تازہ سج دھج لئے اداؤں میں بن کے تزئین بام ودر آئی
لو سحر آئی لو سحر آئی

مٹ رہے ہیں سیاہ رات کے داغ بجھتے جاتے ہیں آنسوؤں کے چراغ
ضوفشاں ہیں دل و نظر کے ایاغ روشنی چار سو ابھر آئی
لو سحر آئی لو سحر آئی

۱۹۷۰ء

عزم و عمل

جب نئے دور کے تقاضوں سے زندگی اپنے رخ بدلتی ہے
آرزو آدمی کے سینے میں نئے انداز سے مچلتی ہے
جذبۂ دِل کی تیز حِدّت سے روح انسان کی پگھلتی ہے
تب طبیعت کے خشک سوتوں سے عزمِ نو کی شراب اُبلتی ہے
جاگ اٹھتا ہے آدمی کا ضمیر نئے سانچوں میں زیست ڈھلتی ہے

ہوش و فکر و خیالِ انساں کو گدگداتی ہے عزمِ نو کی شراب
اِس کی کیفیتوں سے ہوتے ہیں ذہن سرشار جسم و جاں شاداب
اس کے سوز و تپش سے بنتا ہے ذرّہ ذرّہ وجود کا سیماب
سوچ کی گرہیں کھلتی جاتی ہیں اٹھتے جاتے ہیں پردہ ہائے حجاب
ایک پیہم سرور بنتی ہے زندگی اِس سے ہو کے لذّت یاب

عزم ہی کے افق سے دنیا میں آفتابِ عمل ابھرتا ہے
ہے یہی روشنی کہ جس کے طفیل نقشِ ہستی میں رنگ بھرتا ہے
اس کی تابانیوں سے دنیا میں حسنِ انسانیت نکھرتا ہے
آبروئے حیات بڑھتی ہے چہرۂ زندگی سنورتا ہے
آدمی کر کے ذات کی تکمیل رُخ سُوئے کائنات کرتا ہے

یہ جہاں یہ تماشا گاہِ حیات رنگِ عزم و عمل کی ہے تصویر
عزم جذبہ ہے اور عمل صورت عزم احساس ہے عمل تدبیر
عزم تیشہ ہے اور عمل فرہاد عزم ہے شمع اور عمل تنویر
ہوں بہم یہ تو کام بنتا ہے عزم بنیاد ہے عمل تعمیر
اس متاعِ گراں بہا کے بغیر فرد کی ہے نہ قوم کی توقیر

دوستو کارگاہِ ہستی میں عزم کی مشعلیں اٹھائے چلو
آفتابِ عمل سے دنیا کو جگمگائے حسیں بنائے چلو
جب تلک جل سکیں وفا کے چراغ خونِ دل سے انہیں جلائے چلو

۱۹۷۰ء

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

اے وطن اے وطن

کِس کو معلوم تھا یوں بدل جائیں گے آرزو کے فسانے بھی عُنوان بھی
درد کے ہوں گے پیدا نئے سلسلے، غم کے ہو جائیں گے تازہ سامان بھی

اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے وہ سانحے، تھا تصور بھی جن کا نہ امکان بھی
ہوں گی برپا دلوں میں وہ طغیانیاں' جن کے آگے نہ ٹھہریں گے طوفان بھی

کیا خبر تھی سیاست کے ملبُوس میں ہوں گے ایسے سیہ کار انسان بھی
جن کی وحشت سے کانپیں گے حیوان بھی جن کی سیرت سے لرزیں گے شیطان بھی

بڑھتے بڑھتے تعصّب کی تاریکیاں روح کی خلوتوں تک اتر جائیں گی
روشنی کے قدم یوں اکھڑ جائیں گے۔ ہو گی دشوار آپ اپنی پہچان بھی

ہم تو خوش ہو رہے تھے کہ اب کے برس موسمِ گل کا انداز بھرپور ہے
کیا خبر تھی کہ ہو جائیں گے چاک سب' دل بھی سینے بھی جیب و گریبان بھی

اے وطن اے وطن ! دشمنوں نے تجھے کتنے دھوکے دیئے کتنے چرکے دیئے
اور اپنوں نے بھی تجھ کو دے دے کے غم، مضمحل بھی کیا اور پریشان بھی

پھر بھی ہر آزمائش میں نکلا ہے تو اور بھی کامراں اور بھی سُرخرو
تو نہایا بھی اپنے لہُو میں بہت، پختہ ہوتا رہا تیرا ایمان بھی

یہ نئی اِبتلا دوستو ! ہمدمو ! آزمائش بھی ہے اور احسان بھی
دوستوں کا ہوا ہم کو عِرفان بھی' دشمنوں کی ہوئی ہم کو پہچان بھی

ہم پہ ظاہر ہوا ایک رہنے میں ہے کتنی عظمت بھی اور کس قدر شان بھی
آشکارا ہوا حق کا فرمان بھی کھل گیا ہم پہ مفہومِ قرآن بھی

ایک اپنا خدا ایک اپنا نبیؐ ایک قرآن بھی ایک ایمان بھی
ایک اپنی عقیدت کی پہچان بھی، ایک اپنی محبت کا عنوان بھی

ایک ہی اپنے جینے کا انداز ہے ایک دل ایک ہی دل کی آواز ہے
ایک اپنی تمنا بھی ارمان بھی، جسم لاکھوں مگر ایک ہی جان بھی

ایک تھے ایک ہیں اک رہیں گے سدا، ہے ہمارا ابدتک یہی فیصلہ
ہے یہی دین و ایماں کا فرمان بھی، اور یہی اپنی قسمت کا عنوان بھی

اپنی بنیاد ہے دینِ اسلام پر، جان دیتے ہیں ہم دین کے نام پر
ہم نگہباں محمدؐ کے آئین کے، خود محمدؐ ہمارے نگہبان بھی

اہلِ بنگال ہم، اہلِ پنجاب ہم، مشترک ہیں مگر سرحدیں قلب کی
ہم بلوچی بھی، سندھی بھی، افغان بھی، سب سے پہلے مگر ہیں مسلمان بھی

مارچ ۱۹۷۱ء

مرگِ انبوہ

چلتے ہوئے اک ساتھ جھگڑتے جائیں مجہول قیاسات پہ لڑتے جائیں
اے پیرِ فلک تو نے کبھی دیکھے ہیں ! ہم جیسے جوبن بن کے بگڑتے جائیں

احوال و مقامات کا کیا ذکر کریں مردانِ کمالات کا کیا ذکر کریں
خالی ہیں سبو مگر صلا ہے جاری رندانِ خرابات کا کیا ذکر کریں

دنیا میں ہے دیوانوں کی ہر سو بھرمار لیکن ہیں بہ کارِ خویش اکثر ہشیار
وہ قوم ہے کچھ اور نہیں دیوانی آپس ہی میں لڑ مرنے پر ہو جو تیار

ہے چار عناصر سے طلسماتِ وجود ترکیب سے ہے انہی کی سب بست و کشود
لیکن جو یہی الگ الگ ہو جائیں پھر ہوں گے کہاں شاہد و مشہود و شہود

وہ لوگ اصولوں سے جو کرتے ہیں فرار رکھ سکتے نہیں کہیں بھی اپنا معیار
ظاہر میں تو کہسار نظر آتے ہیں اُڑ جاتے ہیں آندھی میں مگر مثلِ غبار

اِس طرح سے دنیا میں ہے کب تک رہنا
خود ساختہ زخموں کا پہن کر گہنا
انبوہ کی مرگ ہے مگر جشن نہیں
اے مقتلِ زندگی ! ترا کیا کہنا

۱۹۷۱ء

دھواں پھیل گیا

ارضِ مشرق میں بجھے مہر و محبت کے چراغ
بستی بستی میں سم آلود دھواں پھیل گیا

چشمہ کورانہ تعصّب کا جو پھوٹا تھا کبھی
بڑھتے بڑھتے صفتِ سیلِ رواں پھیل گیا

زہر برسوں جو گھلا ذہنوں میں وہ آخرِ کار
سرحدِ ہوش سے تا مرکزِ جاں پھیل گیا

قتل و غارت کے وہ ہنگامے ہوئے شہر بہ شہر
کوبکو خونِ محبت زدگاں پھیل گیا

تب کُھلا ہم پہ کہ دو دن میں یہ کیا بیت گئی
جب افق تابہ افق شورِ فغاں پھیل گیا

مضمحل ایسی ہوئی روح کہ سدھ بدھ نہ رہی
کشورِ جاں پہ یمِ شعلہ فشاں پھیل گیا

کچھ لہو تو مرے دل کا مری آنکھوں سے بہا
کچھ فغاں بن کے کراں تابہ کراں پھیل گیا

دسمبر ۱۹۷۱ء

ظالم ہوائیں

موسم بلا کا ظالم ہوائیں پتّوں کی صورت ہم اُڑ نہ جائیں
کیا کیا ہوئی ہیں ہم سے خطائیں کیا کیا ملی ہیں ہم کو سزائیں
دل ہے پریشاں محفل ہے برہم کیا ساز چھیڑیں کیا گیت گائیں
کس شان سے دیں بیٹوں نے جانیں ارضِ وطن کی لے کر بلائیں
دل پر جو بیتی جاں پر جو گزری کس کو سنائیں کیسے سنائیں
دریا سے بڑھ کر دِل میں بھنور ہیں کشتی کنارے کیونکر لگائیں
چپ چاپ بیٹھی ہیں یوں لبوں پر یخ ہو گئی ہوں جیسے صدائیں
بوجھل ہے خود پر اب ذات اپنی اوروں کے کیونکر ہم ناز اٹھائیں

دل کا چمن تو جل ہی چکا ہے
آئیں بہاریں اب یا نہ آئیں

دسمبر ۱۹۷۱ء

وقت کے رخ کو بدلنا ہو گا

سال ہا سال سے حالات کے چہرے پہ رقم
درد اور دکھ کی سلگتی ہوئی تحریریں ہیں
غم و اندوہ کی تفسیریں ہیں
جسم پر زہر بجھی تیغوں کے زخموں کے نشاں
ظلم اور جبر کی منہ بولتی تصویریں ہیں
آگ اور خون کی زنجیریں ہیں
کھل نہیں سکتے ہیں تیروں سے پروئے ہوئے لب
اور سینوں میں اُبلتی ہوئی تقریریں ہیں
اپنے اسلاف کی تکبیریں ہیں

ہم کہ اوروں کی مسیحائی کیا کرتے تھے
سر جھکائے ہوئے اب بیٹھے ہیں بیماروں میں
غم کے ماروں میں دل افگاروں میں
جن تمناؤں کو پالا تھا بڑی چاہ کے ساتھ
روتی پھرتی ہیں وہ سر کھول کے بازاروں میں
دشمنوں اور ستم گاروں میں
ان تمناؤں کا پھر کون نگہباں ہو گا
گھر گئے خود جو ہمیں، خوف کی دیواروں میں
دب گئے درد کے انباروں میں

ارض محبوب ! فدا تجھ پہ ہوئے ہم کیا کیا
اور کیا کیا نہ جہاں درپئے آزار ہوا
ہم سے آمادۂ پیکار ہوا
سرکف ہم بھی رہے تیری محبت میں سدا
گرچہ ہر دشمنِ جاں برسرِپیکار ہوا
حد سے بھی بڑھ کر جفا کار ہوا
حق و انصاف کی آواز ہے تیری آواز
حق کا اِس دور میں جو شخص پرستار ہوا
وہ ترے حق کا طلب گار ہوا

کیا خبر دور ہے کتنی ابھی منزل اپنی
کیا خبر اور کہاں تک ہمیں چلنا ہو گا
کب تک اِس آگ میں جلنا ہو گا
ہاں مگر ہم کو ہے طوفانوں سے لڑنا خود ہی
خود ہی ہر سیلِ حوادث میں سنبھلنا ہو گا
وقت کے رخ کو بدلنا ہو گا
عصرِ حاضر میں بہت سخت ہے پیکارِ حیات
ہم کو حالات کی بھٹی میں پگھلنا ہو گا
اور فولاد میں ڈھلنا ہو گا

۱۹۷۲ء

تکمیلِ داستاں تک

لہو لہو ہے وجود اپنا دیارِ دِل سے سوادِ جاں تک
بیاں کریں حالِ دل تو کیسے کہ ساتھ دیتی نہیں زباں تک

قیامتوں سے گزر گزر کر بھی زندہ ہے داستاں ہماری
نہ جانے کتنی قیامتیں اور بھی ہیں تکمیلِ داستاں تک

جو بے خبر ہیں وہ ہم سے پوچھیں کہ مرحلے راہ میں ہیں کتنے
شفق میں کِھلتی ہوئی صدا سے لہو میں ڈوبی ہوئی فغاں تک

یہی تو ہے انقلابِ دوراں کہ ہے دگر گوں مزاجِ یاراں
رہے تھے ہم جن کے دست و بازو نہیں ہمارے لئے زباں تک

زمانہ دشمن ہوا تو غم کیا کہ ہم اسے خوب جانتے ہیں
جو دوستی پر رہا نہ قائم نبھائے گا دشمنی کہاں تک

بہت غنیمت ہوا ہے رستے میں چند لمحوں کا رک بھی جانا
بچھڑ گئے تھے جو کارواں سے پہنچ رہے ہیں وہ کارواں تک

وفا کے محکم اصول پر ہے چمن سے وابستگی ہماری
زمانہ محدود جس کو سمجھا ہے چند تنکوں کے آشیاں تک

غرض ہمیں کچھ شجر حجر سے نہ بام و در سے نہ سیم و زر سے
ہمارا مقصد تو ہے یہی کچھ جو دل میں ہے آسکے زباں تک

جو عہد تم سے کیا تھا ہم نے وہ اے نگارِ چمن رہے گا
ہمارے عنوانِ آرزو سے تمہاری تکمیلِ داستاں تک

۱۹۷۲ء

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

رنگِ سفر بھی دیکھ لیا

سفر کی راہ بھی رنگِ سفر بھی دیکھ لیا
مزاجِ راہرو و راہبر بھی دیکھ لیا

کچھ اور گرہیں لگائیں ہر ایک نے آکر
ہنروروں کا کمالِ ہنر بھی دیکھ لیا

نہ روشنی کی طلب ہے نہ خوف ظلمت کا
غروبِ مہر و طلوعِ سحر بھی دیکھ لیا

لگائے اس میں جو ہم نے نئے نئے پیوند
تو آرزو کے شجر کا ثمر بھی دیکھ لیا

ملی حریفوں سے سوغاتِ آتش و آہن
نتیجہ ہوسِ سیم و زر بھی دیکھ لیا

دیارِ غیر کے افسانے سنتے آئے تھے
لہو میں ڈوبا ہوا اپنا گھر بھی دیکھ لیا

۱۹۷۲ء

۱۴ اگست

رواں دواں ہے حرارت فشاں ہے آج کا دن
بدن میں وقت کے خونِ رواں ہے آج کا دن

بکھیرتی ہے مسرت کے پھول اس کی ضیاء
بڑا لطیف بڑا مہرباں ہے آج کا دن

دئے اِسی نے نئے باب زندگانی کو
نئے زمانے کا رنگیں نشاں ہے آج کا دن

یہی وہ دن ہے کہ جب ہم نے کربِ پیہم سے
دنوں کا چین شبوں کا سکون پایا تھا

سمٹ گئی تھی اِسی دن وطن کی تاریکی
افق پہ ایک نیا چاند مسکرایا تھا

نئے ستارے مقدّر کے ہم نے ڈھالے تھے
نئی زمیں پہ نیا آسماں بنایا تھا

یہی وہ دن ہے کہ جب حریّت کی دنیا میں
ہمارا قافلۂ شوق ارجمند ہوا

پہنچ گئے سرِمنزل بلاکشانِ وفا
زمانہ گرچہ بہت درپئے گزند ہوا

جو ارضِ پاک پہ لہرایا تھا وہی پرچم
زمینِ جہلم و نیلم پہ بھی بلند ہوا

مگر پلٹ کے یہی دن جو آیا سال کے بعد
تو تھا بھنور میں ہمارا سفینۂ تقدیر

دسیسہ کاریٔ اہلِ جفا ہمارے لئے
بنا رہی تھی نئے سامراج کی زنجیر

بدل گئی تھی جہنم میں جنتِ ارضی
گرفتِ پنجۂ ابلیسیت میں تھا کشمیر

جہاں سے آج بھی یہ دن سوال کرتا ہے
جو ایک ہیں وہ رہیں گے جدا جدا کب تک

فروغِ جبر کہاں تک رہے گا دنیا میں
ہوا کرے گی یہ پامالیٔ وفا کب تک

کریں گے روح کو محبوس تا بہ کَے اعداء
رہے گی حلقۂ زنجیر میں صدا کب تک

۱۹۷۳ء

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

حقیقت اور افسانہ

کتنے افسانے ہیں
تاریخ کے سینے میں کھلے رازوں کی صورت موجود
ایسے افسانے

جنہیں سن کے خیال آتا ہے
کیا کبھی ایسا بھی ہوتا تھا
کبھی ایسا بھی ہو سکتا تھا
یہ فسانے کہ حقائق کی چٹانوں سے نکالے ہوئے
نغمات میں ڈھالے ہوئے
رنگوں میں اچھالے ہوئے
گیتوں کی طرح لگتے ہیں
وقت کے ساز پہ
حالات کی آواز پہ
افکار کی پرواز پہ
چھائے ہوئے کچھ ایسے ہیں
جیسے ساون کے سہانے بادل
جو حقیقت بھی ہیں افسانہ بھی
سامنے آنکھوں کے آتے ہیں حقیقت کی طرح
اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تحلیل بھی ہو جاتے ہیں
ذہن کے پردوں پہ تمثیل سی ہو جاتے ہیں
یا علامت کسی تخیّل کی ہو جاتے ہیں

(۲)

آج کے دور میں بھی

جب کہ ہے سوچ کا سورج ایسا
کوئی سایہ کوئی بادل کوئی وہم
سامنے اس کے ٹھہرتا ہی نہیں
ذہن انساں پہ ابھرتا ہی نہیں
کتنی حیرت ہے کہ افسانوں کے سائے اب تک
میرے احساس پہ لہرائے ہوئے پھرتے ہیں
فکر و ادراک کو دھندلائے ہوئے پھرتے ہیں
اور میں
کل کے سنگین حقائق کو تو افسانہ کہوں
اور جو آج کی ژولیدہ نگاہی کے فسانے ہیں
انہیں
زندگانی کے حقائق سمجھوں
کل نئی سوچ کا سورج جو یہاں ہو گا طلوع
جانے کن نظروں سے دیکھے گا
کن احوال سے جانے گا
کن اندازوں سے پرکھے گا مجھے
اور تاریخ کے اوراق پہ موہوم سے نقطے کی طرح
میں حقیقت نہ فسانہ ہوں گا

۱۹۷۳ء

اندھیری روشنیاں

ترے جہاں میں یہ کیسا زمانہ ہے یا رب
چراغ جلتے ہیں اور روشنی نہیں ہوتی
ہزاروں شمعیں فروزاں ہیں بارگاہوں میں
ہزاروں قمقمے روشن ہیں شاہراہوں میں
وفورِ نور کلیساؤں، خانقاہوں میں
حرم کی راہوں میں بُت خانے کی فضاؤں میں
حریمِ نازِ امارت کی جلوہ گاہوں میں
مگر یہ روشنیاں ہیں فقط نگاہوں میں
کہیں اترتی نہیں ہے دلوں میں کوئی کرن
جہاں اندھیرے ہیں ایسے قدم جمائے ہوئے
کہ جیسے بیٹھے ہوں سادھو کہیں گپھاؤں میں

زمیں پہ روشنیوں کے نئے وسیلے ہیں
نئے چراغ، نئے شمعداں، نئے فانوس
سجے سجے ہیں کچھ اس طرح ان سے کاشانے
کہ جیسے لعل و زمرّد کے ہار پہنے ہوئے
حسین دلھنیں ہوں

چراغِ برق ہیں ہر سو
کہیں ستاروں کے انداز میں دمکتے ہوئے
مہِ دو ہفتہ کی صورت کہیں چمکتے ہوئے

مثالِ مہر و درخشاں کہیں دہکتے ہوئے
ایاغ نور کے ہر سُو فضا میں بکھرے ہوئے
کوئی ہے زہرہ، کوئی مشتری، کوئی شمشاد
اگرچہ جوَت جگانے کے سب یہ حیلے ہیں
مگر یہ جوَت ہے محدود صِرف جسموں تک
چمک ہے ان سے
نہ ذہنوں میں اور نہ سینوں میں
نہ کوئی جلوہ محبت کے آبگینوں میں

عجیب دور ہے یہ دورِ عقل و دانش بھی
دماغ علم سے معمور، روشنی معدوم
نگاہیں تیز بھی طرّار بھی درخشاں بھی
خلا میں پرّاں بھی
بصیرتوں سے مگر دل کے آئنے محروم
مسرتوں کے چھنا کے تو ہر طرف ہیں بہت
مگر گھِرا ہوا انسان ان چھناکوں میں
اداس اور مغموم
نہ ذہن تازہ، نہ دل مطمئن نہ جاں شاداب
امید نقطۂ موہوم
جیسے نقش بر آب
چمک دمک سے نگاہوں میں خیرگی ہے بہت
مگر دلوں کی فضاؤں میں تیرگی ہے بہت

یہ روشنی کہ ہے تخلیق ابنِ آدم کی
اگرچہ خیر تھی لیکن نہ سازگار ہوئی
یہ روشنی بھی ہے تیری عطا مگر یا رب
دلوں کی دنیا میں سورج نیا اتار کوئی

۱۹۷۴ء

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

سہانے بادل

پھر لہکتے ہوئے آئے ہیں گلستاں کی طرف
گم افق پار ہوئے تھے جو سہانے بادل
یوں گھٹاؤں کی طرح برسی ہیں کھل کر آنکھیں
بستی بستی نظر آنے لگا ہر سو جل تھل
اب کے جتنے ہیں مگر سب ہیں خوشی کے آنسو
جن سے کِھلنے لگے ہر دل میں محبت کے کنول

وقت کی آتشِ سفاک نے گھیرا تھا جنہیں
اُس کے شعلوں سے وہ بے داغ نکل آئے ہیں
قتل گاہوں نے دیا عزم اُنہیں جینے کا
موت کے خوف کو قدموں میں مسل آئے ہیں
جن حوادث سے چٹانیں بھی چٹخ جاتی ہیں
اُن سے وہ لے کے نیا جوش عمل آئے ہیں

کامراں رزم گہِ دہر میں ہوتے ہیں وہی
جوڑ لیتے ہیں جو ٹوٹی ہوئی شمشیروں کو
زندگی کو وہی دیتے ہیں نئی تعبیریں
جو جگا سکتے ہیں سوئی ہوئی تقدیروں کو
وہی حالاتِ زمانہ کو بدل سکتے ہیں
جو سمجھ لیتے ہیں الجھی ہوئی تحریروں کو

رات جیسے بھی کٹی کٹ ہی گئی ہے آخر
آؤ اے صبح کے خوش رنگ اجالو آؤ
تم کہ تھے بندِ اسیری میں بھی آزاد ضمیر
ملک و ملّت کے اولوالعزم جیالو آؤ
تم سے شاید ملے پہچان ہمیں بھی اپنی
حسنِ کردار کے آئینہ جمالو آؤ

تم سے پھر عام ہوئی روشنیٔ قلب و نظر
زیست کی راہ میں اک خطِ چراغاں تم ہو
کیوں نہ ہم سب کے دل و جاں ہوں نچھاور تم پر
ملّتِ پاک کی عزت کے نگہبان تم ہو
تم سے تابندہ ہوا اس کے یقیں کا جوہر
بے نوا قوم کا سرمایۂ ایماں تم ہو

۱۹۷۳ء

خونِ شہیداں

یہ دشت اور یہ صحرا، یہ کوہ و بیاباں
یہ پھیلے ہوئے دور تک زرد اور خشک، بے آب و بے برگ و بے
رنگ میداں
یہ افسردہ اور مردہ مٹی کے اُفتادہ پیکر
حرارت سے محروم سرد اور بے جاں
نمو کی ہے قوت تو موجود ان میں
کہ روزِ ازل سے
ہر اِک ذرۂ خاک میں دھڑکنیں زندگی کی ہیں پنہاں
مگر ان میں ایسی ہے خوابیدہ قوت نمو کی
کہ جو خود بخود جاگ سکتی نہیں ہے
جگائے نہ جب تک اِسے اور کوئی
مگر جب کوئی ابرِ باراں، کوئی جوئے رقصاں
ذرا سا انہیں گدگدائے، جگائے
انہیں بادۂ زندگانی پلائے

تو پھر چند دن میں
وہی دشت و صحرا
وہی خشک میداں
وہی زرد، چٹیل، لق و دق بیاباں
تر و تازگی ابر و دریا سے پا کر
گل و لالہ سے دامنوں کو سجا کر

نظر آنے لگتے ہیں مثلِ عروسِ بہاراں

اسی خاکداں کے مکیں ہیں
یہ مٹی کے جاندار پیکر، یہ انساں
کہ ہیں چلتے پھرتے ہوئے گیت گاتے ہوئے، خوش کلام اور خوش وضع اصنام
حرارت بھی ہے ان میں، حرکت بھی ہے اور نمو بھی
رگ و پے میں ان کی رواں ہے لہو بھی
نہاں ان کی نس نس میں ہے آرزو بھی
مگر ان کے خوش وضع پیکر تو مٹی کے خوابیدہ بت ہیں کہ جب تک
جگائے نہ آکر انہیں گرم تازہ لہو اہلِ دِل کا--- نہیں جاگ سکتے
انہی اہلِ دل کے لہو سے
گلستاں گلستاں تروتازگی ہے
زمیں پر یہاں جس قدر زندگی ہے
نگاہوں میں جتنی بھی تابندگی ہے
ضمیروں میں جو کچھ بھی رخشندگی ہے
وہ سب اہلِ دل کے مقدس لہو کا صلہ ہے
مقدّس لہو جو
ہر اک دور میں اہلِ باطل کے ہاتھوں بہا ہے
مقدّس لہو جو
ہر اک دور میں زینتِ تیغ و خنجر ہوا ہے
مقدّس لہو جو
نشانِ بقائے شہیداں راہِ وفا ہے

یہ سب زیب و زینت یہ سب تابناکی
شہیدوں کے حسن عمل کی جزا ہے
میسر ہے جو کچھ ہمیں سرخروئی
ہمارے شہیدوں کا ہی خوں بہا ہے

۱۹۷۵ء

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

خدا ہے نا میرا سو ہنر سنوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

ان یاد مجھے تم کر لینا آواز مجھے تم دے لینا
اس راہ محبت میں کوئی درپیش جو مشکل آ جائے

ہمارا قائد

ہمارا قائد ہمیں زمانے میں بختِ بیدار دینے والا-- نگاہ خود دار دینے والا
وہ اپنی ملّت کی بکھری اینٹوں کو شکلِ دیوار دینے والا -- صلابتِ کار دینے والا

تباہیوں سے بچانے والا' سیاہیوں کومٹانے والا -- فضاؤں کو جگمگانے والا
اندھیری شب کے مسافروں کو سحر کے انوار دینے والا -- نصیب زرتار دینے والا

خزاں سے دامن چھڑایا اُس نے نئی رُتوں کو جگایا اُس نے--کھنڈر کو گلشن بنایا اس نے
غلام صدیوں کے ٹھہرے لمحوں کو ذوقِ رفتار دینے والا -- مزاجِ سیار دینے والا

وہ راہبرِ بے مثال اپنا' امیر فرخندہ فال اپنا -- جلال اپنا جمال اپنا
حسین افکار دینے والا' جمیل گفتار دینے والا -- عظیم کردار دینے والا

وہ میرِ لشکر کہ عزم کامل رہا ہمیشہ شعار اس کا -- عمل پہ تھا انحصار اُس کا
سپاہیوں کو زرہ خودی کی' نگہ کی تلوار دینے والا -- شعورِ پیکار دینے والا

جو ہم پہ اس کی عنایتیں ہیں حسین ان کی روایتیں ہیں -- لذیذ اُن کی حکایتیں ہیں
لبوں کو اظہار دینے والا' گھروں کو دیوار دینے والا -- سروں کو دستار دینے والا

۱۹۷۶ء

خونِ دل

دِل بیانِ غم و اندوہ سے خوں ہوتا ہے
اور چپ رہنے کی کوشش سے جنوں ہوتا ہے
زخم ہر یاد کے چرکے سے فزوں ہوتا ہے
جاں سلگ اٹھتی ہے وہ سوزِ دروں ہوتا ہے

ایسے چھلکے ہوئے جذبات کے پیمانے ہیں
ایک اک اشک میں پنہاں کئی افسانے ہیں

تھر تھراہٹ سی رواں ذہن کے ہر تار میں ہے
کپکپاہٹ سی عیاں موجۂ گفتار میں ہے
ایک طوفان بپا قلزمِ افکار میں ہے
کچھ زیادہ ہی لہو دیدۂ خونبار میں ہے

نہیں افسانہ یہ پروانوں کے جل جانے کا
تذکرہ ہے دلِ انساں کے پگھل جانے کا

جب سے ہم صفحۂ ہستی پہ نمودار ہوئے
ہم سے اشرارِ جہاں برسرِ پیکار ہوئے
جن کی بہبود کے ہم دل سے طلبگار ہوئے
بارہا اپنے وہی درپئے آزار ہوئے

ہم مگر شمعیں وفاؤں کی جلاتے ہی رہے
روشنی دیدۂ انساں کی بڑھاتے ہی رہے

ہم پہ کرتے ہی رہے کفر کے طوفاں یلغار
کشتیِ حق کے مگر ہم نے نہ چھوڑے پتوار
گردشِ چرخ نے ہر چند کہ روندا سو بار
ہم خدا سے ہوئے مایوس نہ دیں سے بیزار

جذبۂ حسنِ یقیں اپنا نگہبان رہا
لٹ گیا اور سبھی کچھ بھی تو ایمان رہا

دشمنوں سے کبھی حاصل نہ ہوا ہم کو فراغ
رہے ہر دور میں تازہ دلِ مجروح کے داغ
بارہا ہوتے رہے چور حکومت کے ایاغ
بارہا بجھتے رہے دانش و حکمت کے چراغ

پھر بھی روشن تھے دلوں میں جو شرارے وہ رہے
تھے جو اُمید کے تابندہ ستارے وہ رہے

ہم کبھی سیلِ حوادث سے پریشاں نہ ہوئے
برق رخشاں تھے چراغ تہ داماں نہ ہوئے

اہرمن زادوں کی قوت سے ہراساں نہ ہوئے
مسلکِ حق و صداقت سے گریزاں نہ ہوئے

جتنی گھر گھر کے مصائب کی گھٹائیں آئیں
اُتنی ہی مشعلِ ایماں میں ضیائیں آئیں

عصرِ حاضر نے مگر لے کے سنانِ تزویر
اہلِ توحید کی رکھ دی ہے اُلٹ کر تقدیر
کارگر جن پہ نہ تھے توپ و تفنگ و شمشیر
ذہنِ عیارِ سیاست کے ہوئے وہ نخچیر

تھے پہاڑوں کی طرح جن کے ارادوں کے حصار
ہو گئے فکر کے میداں میں وہ صیدِ اغیار

ان کے ذہنوں پہ رقم کی گئی تحریر نئی
ان کے افکار کی ہونے لگی تعمیر نئی
اعتبارات کی کھینچی گئی تصویر نئی
خواب ہستی کی بتائی گئی تعبیر نئی

قوم و ملّت کے تراشے گئے مفہوم نئے
دین و مذہب کے معانی ہوئے مرقوم نئے

توڑنا جن کا تھا مقصودِ عظیم اسلام
اُن بتوں کا ہوا پھر سینۂ مسلم میں قیام
تھیں جو عصبیتیں اللہ کے نزدیک حرام
ہیں ہمارے چمنِ دل میں وہی محوِ خرام

رنگ اور نسل کی ذہنوں پہ عملداری ہے
سرحدوں اور زبانوں کی پرستاری ہے

متزلزل ہوئی اس طور سے بنیادِ شعور
خار کو پھول سمجھنے لگے ہم نار کو نور
رقص و نغمہ مئے و مطرب ہوس و فسق و فجور
کتنے مسرور ہیں ہم ان کو بنا کر دستور

کون کہہ سکتا تھا ایسے بھی مسلماں ہوں گے
جاہلیت کے شعاروں پہ جو نازاں ہوں گے

بٹ گیا گلشنِ اسلام خیابانوں میں
روحِ توحید بھٹکنے لگی ویرانوں میں
نہ رہی وحدت افکار مسلمانوں میں
گھل گئے زہر بہت ذہنوں کے پیمانوں میں

ایک ملت تھی مگر بیسیوں اقوام ہوئیں

اور پھر جتنی بڑھیں اتنی ہی ناکام ہوئیں

منتشر ہو گئی قوت جو مسلمان میں تھی
ریزہ ریزہ ہے صلابت جو کہستان میں تھی
جب بھلا دی گئی تعلیم جو قرآن میں تھی
کیسے رہ سکتی تھی وہ بات جو ایمان میں تھی

آ لئے ذہنوں کے دھندلا گئے سارے اپنے
گم ہوئے ظلمتِ باطل میں ستارے اپنے

کٹ کے اپنوں سے جو غیروں کے ہم آہنگ ہوئے
کون سے اُن کے لئے افسرِ اورنگ ہوئے
عرصۂ فکر میں مایۂ فرہنگ ہوئے
آئے میزانِ سیاست پہ تو پاسنگ ہوئے

ظلمتِ شب میں نشانِ مہِ کامل نہ ملا
گھر گئے جب کسی طوفاں میں تو ساحل نہ ملا

کتنے توحید کے فرزند ہیں اصنام کے ساتھ
کتنے بہکے ہوئے پھرتے ہیں مئے و جام کے ساتھ
ربط دل سے تو نہیں کوئی بھی اسلام کے ساتھ

مکر سے دنیا کماتے ہیں مگر نام کے ساتھ

ایسے بگڑے ہوئے اطوار ہیں نادانوں کے
کام جب آتے ہیں آتے ہیں صنم خانوں کے

گر مسلط رہی ذہنوں پہ یونہی بُو لہبی
رہے بیگانۂ پیغامِ رسولِ عربی
ہاتھ آیا نہ اگر گوشۂ دامانِ نبیؐ
غیر ممکن ہے کہ پھر ختم ہو یہ تیرہ شبی

ظلمتیں ہوں گی نہ کم شمعِ اخوت کے بغیر
صبح آئے گی نہ خورشید نبوت کے بغیر

۱۹۷۷ء

الفاظ کا مسیحا

ضمیرِ ہستی پہ تین صدیوں سے ایسی حسرت برس رہی تھی
کہ زندگی سر بسر متاعِ فسردگی تھی
افق پہ تھے مہر و مہ بھی، انجم بھی، کہکشاں بھی
مگر زمیں پہ نہ چاندنی تھی نہ روشنی تھی
شعور سے لاشعور تک ایک سی فضا، ایک سی صدا، ایک سی نوا تھی
فضا میں گھمبیر خامشی تھی
صدا میں بے روح خستگی تھی
نوا میں بے رنگ راگنی تھی
دلوں میں شکوے ابل رہے تھے لبوں پہ آہیں سلگ رہی تھیں
سوال ذہنوں میں اٹھ رہے تھے
مگر زبانیں تھیں گنگ سب کی
سلیقہ شکوے کا تھا کسی کو نہ آہ کا تھا
نہ غیر سے رسم و راہ کا تھا
نہ اپنے دل سے نباہ کا تھا
عجیب بے سوز و ساز و بے کیف زندگی تھی

یہ حال تھا جب افق پہ ابھرا
اک ایسا الفاظ کا مسیحا
قلم کے جادو سے جس نے ہم کو
سلیقہ شکووں کا بھی سکھایا

قرینہ آہوں کا بھی بتایا

سوال جو اٹھ رہے تھے ذہنوں میں اُن کو بڑھ کر
بڑی محبت سے گدگدایا-- گلے لگایا
بنا سجا کر، مثالِ آئینہ جگمگا کر
اُنہیں حریفوں کی انجمن میں وہ لے کے آیا
جمالِ علم و ہنر دکھایا

معانی جو سو رہے تھے لفظوں کی خواب گاہوں میں ان پہ اس نے
قلم سے اپنے گلاب چھڑکا--- انہیں جگایا
شریکِ بزمِ سخن بنایا

یہ کون الفاظ کا مسیحا تھا جس نے آکر
زباں کو حرفِ آشنا بنایا
خموشیوں کو صدا بنایا
قلم کو معجز نوا بنایا
نوا کو بانگِ درا بنا کر
مسافرانِ رہِ وفا کو خجستہ پَے رہنما بنایا
یہ کون الفاظ کا مسیحا تھا جس نے آکر

حروفِ بے جاں کو جاں عطا کی
سکوتِ غم کو زباں عطا کی
ہنر کو تاب و تواں عطا کی
خزف کو جس نے گہر بنایا
سرشک کو آبِ زر بنایا

سخنؔ کو برق و شرر بنایا
سسک رہے تھے جو ذرّے راہوں میں اُن کو شمس و قمر بنایا
جو خود فراموش تھے انہیں خود نگر بنایا

یہ میرا الفاظ کا مسیحا تھا میری ہستی کا رازداں تھا
مرے ارادوں کا ترجمان تھا مری حقیقت کا پاسباں تھا
مری تگ و تاز کے صحیفے پہ میرے اقبال کا نشاں تھا

۱۹۷۷ء

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

زندہ ہیں ہم زندہ ہیں

آن کی خاطر زندہ ہیں
ایمان کی خاطر زندہ ہیں
صدق و صفا کی
مہر و وفا کی
شان کی خاطر زندہ ہیں
عزت اور ناموس کے ہر عنوان کی خاطر زندہ ہیں
زندہ ہیں ہم پیارے پاکستان کی خاطر زندہ ہیں
زندہ ہیں ہم زندہ ہیں

حق و صداقت دین ہمارا
نظم اور ضبط آئین ہمارا
قوم ہے غیرت مند ہماری
فرد ہے یا تمکین ہمارا
دیکھو تو تاریخ اٹھا کر ورق ورق رنگیں ہمارا
ہم تاریخ کے اس رنگیں ایوان کی خاطر زندہ ہیں
زندہ ہیں ہم پیارے پاکستان کی خاطر زندہ ہیں
زندہ ہیں ہم زندہ ہیں

ہیں آگاہ زمانے والے
ہم ہیں عہد نبھانے والے

ابراہیم کی راہ پہ چل کر
آگ میں پھول کھلانے والے
حق سے جو پیمان کیا تھا
اُس کو بھول نہ جانے والے
آئے جو بھی دور اسی پیمان کی خاطر زندہ ہیں
زندہ ہیں ہم پیارے پاکستان کی خاطر زندہ ہیں
زندہ ہیں ہم زندہ ہیں
زندہ ہیں ہم زندہ ہیں
زندہ ہیں ہم زندہ ہیں ہم زندہ ہیں ہم زندہ ہیں

۱۹۷۹ء

پاکستان ورچوئل لائبریری www.pdfbooksfree.pk

آج کے دن

زمیں بھی سیمیں بدن ہوئی تھی فلک بھی زرتار ہو گیا تھا
نظر اٹھائی جو شب زدوں نے ظہورِ انوار ہو گیا تھا

تڑپ کے بیدار ہو گئے تھے وہ دل جو سینوں میں سو گئے تھے
لہو جو تھا منجمد رگوں میں وہ برق آثار ہو گیا تھا

افق افق روشنی کا جادو چمن چمن زندگی کی خوشبو
دماغ مدہوش ہو رہا تھا خیال سرشار ہو گیا تھا

ستیزہ کاری سے دشمنوں کی وجودِ مسلم تھا پارہ پارہ
یہ پارہ پارہ وجود لیکن پھر ایک دیوار ہو گیا تھا

جو ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے وہ مل کے سب ایک ہو گئے تھے
ہٹے نگاہوں سے اُن کی پردے، شعور بیدار ہو گیا تھا

جسے فرنگی دسیسہ کاروں نے مل کے بیمار کر دیا تھا
نئی توانائیوں کا حامل وہ مردِ بیمار ہو گیا تھا

ہر ایک دل کو عطا ہوئی تھی نئی حرارت نئی جسارت
نفس جو سینے میں گھُٹ رہا تھا لپک کے تلوار ہو گیا تھا

گزر گئی ایک عمر لیکن وہ ذائقہ آج بھی ہے باقی
جو چومنے پر نئی سحر کو لہو میں بیدار ہو گیا تھا

کرمؔ اسی غم نے مار ڈالا کہ بڑھ سکا کس لئے نہ آگے
وہ جذبۂ حریّت جو اپنا نشانِ کردار ہو گیا تھا

---

۱۴ اگست ۱۹۸۳ء

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

مشعلِ تاباں

وفا کی راہ میں ہر چند خارزار آئے
قدم بہ فیضِ جنوں اپنے استوار آئے

ہمیں خیال نہ مرنے کا تھا نہ جینے کا
بس ایک دھن تھی کہ گلشن پہ پھر بہار آئے

اس آرزو میں سہا جاں پہ بارِ غم صدیوں
کہ دل کی شاخِ تمنا پہ برگ و باد آئے

لہو سے جن کے ہوا گلشنِ وفا سیراب
اُنہی کے حصے میں گل ہائے افتخار آئے

خیال آتا ہے ہر روز اُن شہیدوں کا
جو قول ہارے نہیں جان اپنی ہار آئے

ہے ذرّے ذرّے میں بوباس اپنے پیاروں کی
وطن کی خاک پہ کیوں ٹوٹ کر نہ پیار آئے

ہم ایک مشعلِ تاباں کو لے کے نکلے ہیں
اب اس کے سامنے خورشیدِ زرنگار آئے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

غزل

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

زخم دل کا اگرچہ گہرا ہے رنگ اس کا مگر سنہرا ہے
اے فرشتو! پکارتے ہو کسے آدمی اس صدی کا بہرا ہے
کوئی دروازہ ہم پہ کھلتا نہیں سب پہ جادوگروں کا پہرا ہے
ایک قطرہ لہو کا تھا دل میں وہ بھی پلکوں پہ آکے ٹھہرا ہے
جل رہے ہیں جہاں لہو کے چراغ کس عمارت کا وہ کٹہرا ہے
زخمِ احساس کو چھپاؤں کہاں یہ مرے دل سے بڑھ کے گہرا ہے

کوئی پتہ نہ کوئی پھول کرمؔ
زندگی ہے کہ خشک صحرا ہے

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

عشق کی دنیا میں کیا کیا ہم کو سوغاتیں ملیں
سُونی صبحیں، روتی شامیں جاگتی راتیں ملیں

یا برستی دھوپ میں تپتے، سلگتے دن ملے
یا ردائے درد میں لپٹی ہوئی راتیں ملیں

گہ اُجڑ جانے کا ماتم، گہ بچھڑ جانے پہ شور
دل کے اندر جب ملیں نوحوں کی باراتیں ملیں

کچھ صباحت کچھ ملاحت تھی نصیبِ عاشقاں
آنسوؤں کے رنگ میں نمکین برساتیں ملیں

کھوکھلے چہروں پہ سیم و زر کی تھیں آرائشیں
اہلِ معنی کو مگر لفظوں کی خیراتیں ملیں

کھیلنے والے وہی دس بیس شطرنجی رہے
دیکھنے والوں کو شہہ ماتوں پہ شہہ ماتیں ملیں

زلزلے آئے تو جو پیکر تھے سنگ و خشت کے
ان کے ہونٹوں پر دعائیں اور مناجاتیں ملیں

ہم انہی کو شعر کا قالب عطا کرتے رہے
بے صدا ہونٹوں پہ جو بکھری ہوئی باتیں ملیں

چاند سے اک بار منہ پھیرا جو یاروں نے کرمؔ
بھول کر بھی پھر نہ اُن کو چاندنی راتیں ملیں

○

جو کچھ مرے خیال کی پہنائیوں میں ہے
اس سے بھی کچھ سوا تری رعنائیوں میں ہے

دیکھوں جسے وہی ترے شیدائیوں میں ہے
تو ہے کہ مستِ ناز خود آرائیوں میں ہے

اتری ہے دل میں ہوش کے زینے سے تیری ضو
میرا شعور بھی ترے سودائیوں میں ہے

کیا اوپری نگاہ سے سمجھیں گے چارہ گر
دل کا ہر ایک زخم تو گہرائیوں میں ہے

تنہا کیا جہاں میں مجھے جس خیال نے
اب رخنہ زن وہی مری تنہائیوں میں ہے

سنتا نہیں ہے کوئی کسی کی یہاں پکار
ہر شخص اپنے درد کی گہرائیوں میں ہے

مجھ کو اسی لئے تو ہے نادانیوں پہ ضد
نفرت کا زہر شیخ کی دانائیوں میں ہے

مل جائے گر کہیں تو کروں خضر سے سوال
گمنامیوں میں لطف کہ رسوائیوں میں ہے

کتنی حسین ہیں مری رسوائیاں کرمؔ
وہ فتنہ گر بھی میرے تماشائیوں میں ہے

سنبھل گئے ہیں جہاں میں بیمار کیسے کیسے مگر ہیں قسمت میں اپنی آزار کیسے کیسے

خبر کہاں نغمگی میں ڈوبی سماعتوں کو کہ زخم کھاتے ہیں ساز کے تار کیسے کیسے

یہی تھا وہ شہرِ دل کہ سُونا پڑا ہوا ہے یہاں محبت کے تھے خریدار کیسے کیسے

یہی دریچے کہ جن میں تنہائیاں بسی ہیں انہی میں تھے لوگ شُعلہ رخسار کیسے کیسے

خیال میں جھولتی تھیں کیا پھول پھول شاخیں نظر اٹھائی تو چبھ گئے خار کیسے کیسے

جھڑی میں اشکوں کی بہہ گئے دُھل کے رنگ سارے بنے تھے دل میں نقوشِ دلدار کیسے کیسے

کوئی خضر ہی نہ تھا مقدّر میں اپنے ورنہ یہاں دفینے تھے زیرِ دیوار کیسے کیسے

بھنوُر میں آتی ہے کام تدبیر ناخدا کی وگرنہ ٹوٹے پڑے ہیں پتوار کیسے کیسے

نہ دوستی کا پتہ چلے ہے نہ دشمنی کا ملے ہیں بن بن کے یارا غیار کیسے کیسے

جو آ کے بیٹھے ہیں اب کرمؔ کیا خبر ہے ان کو
اٹھے ہیں اِس میکدے سے میخوار کیسے کیسے

کبھی بنی نہ بنائی فریب کاروں سے
یہی تو جرم ہوا ہم گناہ گاروں سے

میں جس کو چاند سمجھتا تھا اُس نے بہکایا
وگرنہ مجھ کو شکایت نہ تھی ستاروں سے

لطیف ہے مرا دامن صبا کے آنچل سا
بغیر اُلجھے گذرتا ہوں خارزاروں سے

طلب ہوئی نہ کبھی مجھ کو ایک جُرعے کی
رہی ہے گرچہ رفاقت بھی بادہ خواروں سے

جو لوگ زندہ تھے مٹی بھی اُن کی زندہ ہے
صدائیں آتی ہیں کیا کیا مجھے مزاروں سے

پڑا ہے کھُل کے ہی کہنا کہ بات بنتی نہیں
ہماری بزم میں خوش رنگ استعاروں سے

ملے گا خاک میں جب خونِ گرم دہقاں کا
تو شعلے پھوٹ کے نکلیں گے شاخساروں سے

بس اک خلوص و محبت کی ہے فضا درکار
ہزار نغمے اُبلتے ہیں دل کے تاروں سے

جگا رہے تھے نئے زمزمے دِلوں میں کرمؔ
مگر وفا ہی نہ کی زندگی نے یاروں سے

یوں نہ اے فصلِ گل گذر جانا ہم پہ الزام کوئی دھر جانا
عمر بھر ہم جلے کہ عادت تھی جس طرف آگ ہو اُدھر جانا
دوستو! شب سے ہم نمٹ لیں گے تم سرِ شام اپنے گھر جانا
تھی محبت کو زندگی کی طلب اور سیکھا تھا ہم نے مرجانا
لگ کے بیٹھے ہیں تیری چوکھٹ سے اب کہاں آنا اور کِدھر جانا
میرے ٹوٹے پروں کو دیکھ تو لو ہمصفیرو! ذرا ٹھہر جانا
جام بھرنے سے ہے کہیں مشکل نیّتِ آدمی کا بھر جانا
بوُئے گل مل سکے تو بادِ صبا میرے آنگن سے بھی گذر جانا
کیا قیامت ہے شوقِ کوئے جمال جا نہ سکنا اُدھر مگر جانا

صلۂ فصلِ گل یہی ہے کرمؔ
پتیوں کی طرح بکھر جانا

سخن کے آئنوں کو پاش پاش کرتے رہے
ہم اپنے لفظوں میں معنی تلاش کرتے رہے

لگاوٹوں سے رقیبوں نے جب بھی بہلایا
محبتوں کے سبھی راز فاش کرتے رہے

بچا تھا کچھ جو رگوں میں لہو تمنا کا
اسی کو بیچ کے حاصل معاش کرتے رہے

شکست رنگ سے خوشبو بھی ریزہ ریزہ ہوئی
چمن میں ہم یہی ریزے تلاش کرتے رہے

انا کی راکھ ہے لپٹی ہوئی چٹانوں سے
یہ کون لوگ یہاں بودو باش کرتے رہے

دیئے حریفوں نے خنجر جو زرنگار ان سے
خود اپنے آپ کو ہم قاش قاش کرتے رہے

سلگتے نغمے مرے برق پاش تو نہ ہوئے
لہو میں پیدا مگر ارتعاش کرتے رہے

بچھڑ گئے تھے سرِ شام ہی جو ہم سے کرمؔ
ہم اُن ستاروں کو شب بھر تلاش کرتے رہے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

○

خود کو جانِ جہاں سمجھتا ہے آدمی اب کہاں سمجھتا ہے
کِسی کو سمجھایئے کہ ہر کوئی اپنی اپنی زباں سمجھتا ہے
ہم ہی ناداں تھے ورنہ ہر انساں اپنا سود و زیاں سمجھتا ہے
میرے زخموں کو دیکھ کر بھی وہ مجھ کو افسانہ خواں سمجھتا ہے
میری رودادِ غم نصیبی کو میرا حسنِ بیاں سمجھتا ہے
عشق اک آگ تھی مگر اس کو اب زمانہ دھواں سمجھتا ہے
بِن کہے کس پہ میرا حال کھلے کون دل کی زباں سمجھتا ہے
قیس دیوانہ ہو گیا آخر گرد کو کارواں سمجھتا ہے
آسماں ہے اسی کا دشمنِ جاں جو اسے مہرباں سمجھتا ہے
دھوپ میں اور بھی جلائے اُسے جو اِسے سائباں سمجھتا ہے

چند شمعیں جلا کے اُن کو کرمؔ
آدمی کہکشاں سمجھتا ہے

○

شررِ فشاں مرے سینے کا گھاؤ ایسا ہے
کہ قطرہ قطرہ لہو کا الاؤ ایسا ہے

جھلس کے بھی غمِ دوراں سے ماند ہو نہ سکا
نگارِ شہر کے رخ پر سبھاؤ ایسا ہے

پڑاؤ ایسا یہ دنیا کہ دل ہٹے ہی نہیں
قدم ٹکے ہی نہیں چل چلاؤ ایسا ہے

مزا کچھ اور بھی آئے ملیں جو روٹھے ہوئے
ہمیں بتوں کے منانے کا چاؤ ایسا ہے

طلب ہمیں بھی وفا کی بہت رہی لیکن
کہیں خرید نہیں پائے بھاؤ ایسا ہے

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
PAKISTANIPOINT
پاکستانی پوائنٹ

چھپے ہیں تیر بہت اس کی مسکراہٹ میں
بگاڑ کھلتا نہیں ہے بناؤ ایسا ہے

میں اعتماد کے خنجر سے زخم زخم ہوا
کہ وار دوست کا دشمن کے داؤ ایسا ہے

گماں نہیں کہ ٹھہر جائے صبر کی دیوار
وفورِ اشک میں اب کے بہاؤ ایسا ہے

کرم ہنسوں جو ذرا سا تو آنکھ بھر آئے
مرے خمیر میں غم کا رچاؤ ایسا ہے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

زمانہ گذرا ہے دل میں یہ آرزو کرتے
کہ تیرے اشکِ ندامت سے ہم وضو کرتے

لہو سفید ہوا تھا سب اہلِ دنیا کا
ہم اپنے خون سے کس کس کو سرخرو کرتے

یہی تو ایک تمنا رہی دوانوں کی
کبھی کبھی ترے کوچے میں ہاؤ ہو کرتے

اب اِس کے بعد خدا جانے حال کیا ہو گا
کہ ہم تو جاں سے گئے حفظِ آبرو کرتے

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

بہت ہی سادہ سی اک آرزو ہماری تھی
زمانے گذرے مگر شرحِ آرزو کرتے

یہ صبح و شام سیاست کا رونا کیسا ہے
کبھی تو ہم سے محبت کی گفتگو کرتے

ہمیں تو پیرِ مغاں جامِ صبر دے کے گیا
حریف پھرتے ہیں اب تک سبُو سبُو کرتے

کرمؔ جو دیکھا تو تھے مارِ آستیں اپنے
کٹی تھی عمر جنہیں زینتِ گلو کرتے

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

جو ہے نصیب میں اس کا سوال کیا کرنا
نہیں تو پھر نہ ملے کا ملال کیا کرنا

مدار نقشِ عمل کا ہے دل کی نیت پر
جو دل بجا ہے تو فکرِ مال کیا کرنا

سموم وقت کی ہر چیز کو جُھلس دے گی
غرورِ زلف و رُخ و خطّ و خال کیا کرنا

متاعِ زیست بہت ظرفِ آدمی کم ہے
جو کشتیوں کو ڈبوئے وہ مال کیا کرنا

پاکستانی ڈاٹ کام

تمام عمر کا حاصل ہے ایک لمحۂ شوق
جو یہ ملے تو رغمِ ماہ و سال کیا کرنا

کبھی یہ حال میں آئے تو ہم پھریں بے حال
اب ایسے وحشیٔ دل کو بحال کیا کرنا

جہاں نگاہ سے محروم ہوں کمال شناس
وہاں تفاخرِ کسبِ کمال کیا کرنا

مکیں ہیں گنبدِ بے در کے اس لئے چپ ہیں
خود اپنے آپ سے ہی عرضِ حال کیا کرنا

ملا لیا ہے جو پیرِ مغاں کے ہاتھ سے ہاتھ
تو اُس کے بعد کرم رقیب و قال کیا کرنا

چند کرنوں کو ہی کیوں روز تھرکتا دیکھوں
کبھی سورج کو بھی اے کاش چمکتا دیکھوں

تو مرے عشق کو اِک جذبۂ عامی سمجھے
میں ترے حُسن کو آفاق میں یکتا دیکھوں

اپنے افکار تو کانٹوں میں پرو لوں لیکن
کس طرح پھولوں کو راہوں میں سِسکتا دیکھوں

بیج کچھ اور تھے پھل اور یہ قصہ کیا ہے
کن طلسمات کی فصلوں کو میں پکتا دیکھوں

کون سے دور میں قدرت نے مجھے بھیجا ہے
مجھ سے پہلے جو کوئی دیکھ نہ سکتا، دیکھوں

اپنے چہرے کو بھی خود اپنے سے روکش پاؤں
اپنے سائے کو بھی پہلو سے سرکتا دیکھوں

برف ہے سر پہ مگر آگ ہے سینے میں وہی
دل کو جب دیکھوں تو پہلے سا ہمکتا دیکھوں

ہائے وہ شہرِ محبت کہ شناسا نہ رہا
میں ہمیشہ جسے یادوں میں دھڑکتا دیکھوں

کبھی آؤں تو جنہیں دیکھنا چاہوں نہ ملیں
اور نہ آؤں تو انہیں راستہ تکتا دیکھوں

اِک نیا پردہ ہے آنکھوں پہ زمانے کی کرم
اپنی آنکھوں سے اُسے کاش سرکتا دیکھوں

ہمارا کام تو تھا سیپیوں میں گھر کرنا
پھر آفتاب کو خود تھا ہمیں گہر کرنا

شکستہ دل بھی، سفینے بھی، حوصلے بھی مگر
سمندروں میں بھی ناچار ہے سفر کرنا

وفا طلب ہیں بہت معرکے محبت کے
نہانا خون میں اور آنکھ کو نہ تر کرنا

نہ جانے سیکھا ہے کس سامری سے یاروں نے
عمل کو چھوڑ کے لفظوں کو معتبر کرنا

جہاں پہاڑ نہ دریا نہ دشت حائل ہوں
شکستِ شوق ہے اس راہ پر سفر کرنا

پھر آیا دور جو نمرود کی خدائی کا
تو پھر ہمیں کو ہے شعلوں کو اُس کے سر کرنا

ہمیں تو ذات کی تاریکیوں نے گھیرا ہے
وگرنہ سہل تھا ہر رات کا سحر کرنا

کرمؔ دراز ہوئے سلسلے ستم کے بہت
ستم گروں سے ہے اب قصہ مختصر کرنا

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

اداس لمحوں میں آخر وہ مل گیا تھا مجھے
مری ہی آنکھوں کی چلمن سے جھانکتا تھا مجھے

میں قربتوں کی تمازت سے جل رہا تھا کچھ اور
وہ آنسوؤں کی جھڑی سے بجھا رہا تھا مجھے

لپٹ کے مجھ سے بڑی سادگی کے لہجے میں
نہ جانے کس کے فسانے سنا رہا تھا مجھے

اُسے یہ غم کہ تھا یادوں کے کرب میں تنہا
مجھے یہ شکوہ کہ اُس نے بھلا دیا تھا مجھے

میں خود ہی خواب جزیروں میں گم رہا شاید
وہ لہر لہر میں ورنہ پکارتا تھا مجھے

عجیب عالمِ وارفتگی میں ڈوبا ہوا
بڑے قرینے سے پھر آزما رہا تھا مجھے

مگر یہ کیسا تحیّر تھا اس کی آنکھوں میں
کہ دیکھتا تھا مجھے جیسے سوچتا تھا مجھے

نہ جانے کتنے نئے وسوسوں کا ناگ کرمؔ
اتر کے میری رگ و پے میں ڈس رہا تھا مجھے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

○

ہم اگر داستاں سرا ہوتے تم ہی تم حرف مدعا ہوتے
حبس تو اس طرح نہ ہو جاتا گر دریچے دلوں کے وا ہوتے
بٹ نہ جاتے جو درد تھے اپنے تم اگر درد آشنا ہوتے
دلربائی ہنر ہے کھیل نہیں عمر لگتی ہے دلربا ہوتے
پھول دوچار ہی جو لے آتی تجھ سے شکوے نہ اے صبا ہوتے
ناؤ ڈوبی تو بولے اہلِ خرد ہم اگر اس کے ناخدا ہوتے
کاش ہوتے صدا کی صورت تم اور ہم سایۂ صدا ہوتے
تم دمکتے قبائے زر کی طرح اور ہم تکمۂ قبا ہوتے
عمر گذری اسیریٔ دل میں دل سمجھتا تو ہم رہا ہوتے
دل کے صحرا میں گر نظر آتے کیسے کیسے نقوشِ پا ہوتے
کوئی آواز تو سلگتی کرمؔ
نالے ہوتے جو نارسا ہوتے

پاکستان ورچوئل لائبریری

آنکھوں نے الٹ ڈالے سب دل کے نقاب آخر
اٹھّا تھا جو سینے سے برسا وہ سحاب آخر

کانٹوں پہ بسر کرنا دشوار تو ہے لیکن
زخموں سے چھلکتی ہے خوشبوئے گلاب آخر

کب خواب جزیروں سے پلٹا یہ مسافر دل
جب قریۂ جاں میں تھا موسم کا شباب آخر

آغازِ محبت کے سب نقش سہانے تھے
ہر نقش مگر نکلا مانندِ سحاب آخر

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

تھا ناز بہت جن کو تاویلِ معانی پر
اوڑھے ہوئے پھرتے ہیں لفظوں کے نقاب آخر

ہم میکدہ والوں کی اس رنگ میں گذری ہے
سرمست و خراب اول سرمست و خراب آخر

لائے گی کرمؔ کب تک تاب اپنی نگاہوں کی
گِر جائے گی خود اک دن دیوارِ حجاب آخر

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

اب مجھے غم کے اندھیروں سے بچائے رکھنا
پیار کی شمع جلائی تو جلائے رکھنا

قریۂ جاں میں نہیں پھول کوئی مدّت سے
اپنی خوشبو ہی میں تم اس کو بسائے رکھنا

میں تو اک خشک سے پتّے کے سوا کچھ بھی نہیں
تم مجھے آس کی ٹہنی سے لگائے رکھنا

راستہ چلتے جو تصویر ملی ہے تم کو
اس کو نظروں سے زمانے کی بچائے رکھنا

اپنا پیمانِ وفا تادمِ آخر کا ہے
سانس کو ڈور محبت کی بنائے رکھنا

ان دنوں شہر میں ہے دھوم لٹیروں کی بہت
اپنے پہلو میں مرے دل کو چھپائے رکھنا

ہر حسیں چہرے کے آئینے میں تم ملتے ہو
کیسے ممکن ہے نظر تم سے چرائے رکھنا

شوق کی آگ میں جل جاؤں تو اے جانِ وفا
اپنے کوچے میں مری خاک اڑائے رکھنا

روشنی چاہئے مجھ کو شبِ ہجراں کے لئے
اپنے پلکوں پہ مرے اشک سجائے رکھنا

جانے آجائے کرم کب وہ مسافر تیرا
دل کی دہلیز پہ اک شمع جلائے رکھنا

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

منحرف مجھ سے ہوا ہے دلِ کافر میرا
جانے کب لوٹ کے آئے یہ مسافر میرا

نقش کچھ ایسے بنا کر جو مٹائے نہ مٹیں
کس لئے چھوڑ گیا مجھ کو مصوّر میرا

میری تصویر سے پہچاننے والے مجھ کو
میرے باطن سا مصفّا نہیں ظاہر میرا

اب کسی عکس پہ بھی مجھ کو بھروسا نہ رہا
ایسا دھندلایا ہے آئینۂ خاطر میرا

ایسی گھمبیر فضاؤں سے تو ڈر آتا ہے
تھک کے گر جائے نہ آواز کا طائر میرا

صاحبِ فن بھی ہوں آگاہِ جزائے فن بھی
خامہ یاور ہے تو کیا بخت ہے قاصر میرا

ہر مسیحا نے یہاں مجھ کو ہی مصلوب کیا
کس سے میں پوچھتا کیا جرم تھا آخر میرا

ہائے کس پیار کے لہجے میں کہا اُس نے کرمؔ
آج کل کون سے حالوں میں ہے شاعر میرا

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

تو چاند مانگے ہے گھر میں چراغ بھی نہ رہا
سلگ رہا تھا جو اے دل وہ داغ بھی نہ رہا

خیال یہ تھا کہ شاید کرے گا دل پیدا
فقیہِ شہر میں لیکن دماغ بھی نہ رہا

فراغ ڈھونڈنے آئے تھے بزمِ یاراں میں
وہ عہدِ عشق جو تھا بے فراغ بھی نہ رہا

مٹائے ہم نے خود اپنے نقوش کچھ ایسے
کہ عمرِ رفتہ کا باقی سراغ بھی نہ رہا

پھرے تھا قریہ بہ قریہ لئے ہوئے جس کو
فقیر کا وہ شکستہ ایاغ بھی نہ رہا

یہ انقلاب کرامت تھی کیا کہیں کس کی
کہ عندلیب کو مقدورِ زاغ بھی نہ رہا

ہم اپنی روح کو کیونکر سنبھالتے کہ کرمؔ
ہمارے بس میں دل داغ داغ بھی نہ رہا

نہ تاج دیکھا ہے ہم نے نہ تخت دیکھا ہے
سر اپنا دیکھا ہے اور سنگِ سخت دیکھا ہے

ہرا ہوا بھی تو کیا، خشک رہ گیا بھی تو کیا
کہ بے ثمر ہی وفا کا درخت دیکھا ہے

لہولہان خرابوں میں دے رہا ہوں صدا
کسی نے میرا دلِ لخت لخت دیکھا ہے؟

ہماری بام پہ جب آئے چاند گہنائے
جہاں نے ہم سا کہاں تیرہ بخت دیکھا ہے!

ملائمت میں تھے جو لب کہ برگِ گل کی طرح
انہی کے لہجے کو ہم نے کرخت دیکھا ہے

وقار عظیم
پاکستان پوائنٹ
ڈاٹ کام

قبائے درد پہ زخموں کے پھول کھلتے ہوئے
ستم زدوں کا یہی ساز و رخت دیکھا ہے

ملے کہیں کوئی پیرِ مغاں تو بات بنے
کہ واعظوں کو بہت دل کا سخت دیکھا ہے

سکندری تو بدلتی ہے روز بھیس کرمؔ
قلندری کا مگر ساز و رخت دیکھا ہے!

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

رفتہ رفتہ جب لہو میں آنچ کم ہو جائے گی
دل کی دھڑکن خود بخود بے زِیر و بم ہو جائے گی

چاند اپنی چاہتوں کا جب نہ آنگن میں رہا
کس قدر تاریک میری شامِ غم ہو جائے گی

دیکھ لو جو چاہو جب تک آنسوؤں کے ہیں چراغ
روشنی ان مشعلوں کے بعد کم ہو جائے گی

گر یہی ہے تشنہ کامی گر یہی ساقی گری
بوند پانی کی شرابِ جامِ جم ہو جائے گی

مجھ کو کیا معلوم کیا انجام ہے میرا مگر
میری مٹی تیری ہستی کا بھرم ہو جائے گی

گو بظاہر تجھ سے بے پروا نظر آئیں گے ہم
جب بھی تیرا نام لیں گے آنکھ نم ہو جائے گی

اب جو کم کم سوز و نم ہے اس کو بھی روئیں گے لوگ
زندگی جب اور بھی بے سوز و نم ہو جائے گی

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

لو بھی قاتل سے لگائے رکھنا سر بھی کاندھوں پہ اٹھائے رکھنا
بات بے بات جو بگڑا جائے اس سے کیوں کر ہو بنائے رکھنا
کیا خبر روشنیاں کب بجھ جائیں اک دیا گھر میں جلائے رکھنا
ہم نے چاہا بھی مگر ہو نہ سکا اپنی چاہت کو چھپائے رکھنا
غم کی کلیوں سے کہاں تک ہو گا دل کی گلیوں کو سجائے رکھنا
دل ہو پہلو میں تو مشکل کیا ہے آسماں سر پہ اٹھائے رکھنا
کامیابی ہو کہ ناکامی ہو زندگی دھوم مچائے رکھنا
خواہشیں حسرتیں بن جاتی ہیں دل کو اے دوست بچائے رکھنا
اس طرح کٹتی ہے کب راہِ حیات ساتھ اپنے نہ پرائے رکھنا

آندھیاں تیز ہیں آنگن میں کرمؔ
گھر کی دیوار بچائے رکھنا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کب یہاں قافلۂ بادِ بہاری ٹھہرا
دل کا گلشن تو خزاں ہی کا پجاری ٹھہرا

ہر کوئی اپنے ہی زخموں کو لئے پھرتا ہے
کون پھر صید ہوا کون شکاری ٹھہرا

لوگ کیا مانگنے آتے ہیں در جاناں پر
میں تو خوشبوئے محبت کا بھکاری ٹھہرا

اے مرے قریۂ محبوب کو جانے والے
میں بھی آتا ہوں ذرا اپنی سواری ٹھہرا

اس کی خوشبو کے تعاقب میں اڑائے لے چل
مجھ کو راہوں میں نہ اے بادِ بہاری ٹھہرا

عقل سے پوچھئے کیا جیتی ہے کیا ہاری ہے
دل بچارا تو محبت کا جواری ٹھہرا

عمر اک وقت کے صحرا کے سوا کچھ بھی نہیں
مشغلہ اپنا جہاں ذرّہ شماری ٹھہرا

اپنے چہروں کو چھپائے ہوئے پھرتے ہیں کرمؔ
کام یاروں کا جہاں آئنہ داری ٹھہرا

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

بقدرِ خواہشِ دل ہو سکی نہ بات اس کی
کہ میری سوچ سے بھی خوب تر تھی ذات اس کی

تمام جذبوں کی پاکیزگی کا حاصل تھی
اٹھی جو میری طرف چشمِ التفات اس کی

وہ بیکراں تھا مگر یوں سما گیا مجھ میں
کہ جیسے دل ہی تو میرا تھا کائنات اس کی

جمالِ رخ نے ہی مجھ کو نہ کر لیا مسحور
تھی گفتگو میں بھی شیرینیٔ نبات اس کی

تھا حرف و لفظ میں جادو جو اس کی پوروں کا
اتر گئیں مرے دل میں نگارشات اس کی

میں اُس کے پیار میں ڈوبا تو یوں ہوا محسوس
گہر گہر تھی سمندر سے بڑھ کے ذات اس کی

یوں نکھر کے ابھرا ہے رنگِ داستاں اپنا
حرف حرف اِس کا ہے نقشِ جاوداں اپنا

غم تھے جانستاں لیکن ہم بھی سخت جاں نکلے
سینۂ تپاں میں تھا شوق حرزِ جاں اپنا

سوز بھی فراواں ہے درد بھی فزوں لیکن
دل میں آگ ہے اپنی، لب پہ ہے دھواں اپنا

دور اس کی زد سے ہے برف سرد مہری کی
پھونک دے نہ خود ہم کو شعلۂ بیاں اپنا

میل پھر بتوں سے کیا ہم نے تو یہی دیکھا
دوستی فریب ان کا، دشمنی زیاں اپنا

دشتِ آرزو میں ہیں ہم سفر بگولوں کے
ھو کا ایک نعرہ ہے میرِ کارواں اپنا

اپنی ظلمتوں میں گم دیکھتے ہیں یوں جیسے
راستہ بدل دے گی جوئے کہکشاں اپنا

بارہا لٹے ہیں ہم زندگی کی راہوں میں
پھر بھی کاروانِ شوق ہے رواں دواں اپنا

اے دبیرؔ آسماں تجھ سے پوچھنا یہ ہے
کب تلک یونہی آخر ہوگا امتحاں اپنا

ہم کہ باوفا بھی ہیں پیکرِ انا بھی ہیں
بے سبب ہوا ہے کب دشمن آسماں اپنا

آشنا کے پردے میں وہ بھی غیر ہی نکلا
عمر بھر کرمؔ سمجھے جس کو مہرباں اپنا

اب درد خریدا ہے تو پھر ذکرِ دوا کیا
بیمار ہی اچھے ہیں تو پروائے شفا کیا

مطلوب ہی جب غنچۂ دل کو نہ ہو کِھلنا
پھر غمکدۂ جاں کے لئے بادِ صبا کیا

میں دشتِ طلب میں بھی پریشاں تو نہیں ہوں
میرے لئے اے شہرِ طرب تیری ہوا کیا

دونوں سے گذر جانا ہے معیارِ محبت
مستوں کی نگاہوں میں بقا کیا ہے فنا کیا

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

"'

ہم اپنی انا بیچ کے جنت نہ خریدیں
دنیا ہمیں کیوں ملتی ہے دنیا کو ہُوا کیا

اک عمر تو کی صرفِ بتاں اے دلِ ناداں
پھر ان سے چلا باندھنے پیمانِ وفا کیا

دل نالہ و فریاد سے ہلکا ہوا ورنہ
ہے سیلِ ستم کے لئے دیوارِ صدا کیا

مل جائے کرمؔ مجھ کو جو فرہاد تو پوچھوں
جینا ہو جو دشوار تو مرنا ہے روا کیا

وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

زمانے لمحوں میں ڈھل کے ہوتے رہے فسانے
مگر جو لمحے ٹھہر گئے بن گئے زمانے

ہم اپنے زخموں کو بند کلیاں ہی رہنے دیتے
مگر کھلائے ہیں گل یہاں موجۂ صبا نے

عجیب سرگوشیوں کے انداز میں کہے ہیں
مرے رفیقوں نے مجھ سے آکر مرے فسانے

میں بے وفا تھا نہ بے نوا تھا نہ کج ادا تھا
وہ چاہتا تھا مگر بگڑنا کسی بہانے

خطا یہ تھی کہہ دیا تھا دشمن کو ہم نے دشمن
تمام جھگڑے اسی خطا کے ہیں شاخسانے

شبیں گذرتی رہیں مگر جو سحر بھی آئی
نئے نئے وسوسوں کے لائی ہے تانے بانے

بھنور میں آخر خدا کا ہی نام کام آیا
سفینہ ورنہ ڈبو ہی ڈالا تھا ناخدا نے

زمانہ بدلا ہزار لیکن ہماری قسمت
وہی محبت، وہی محبت کے غم پرانے

عجب محبت کی صورتیں ہیں ضرورتیں ہیں
میں اس کی یادوں کے ساتھ خود کو لگا بھلانے

نئے زمانے میں بھی کرم حال ہے یہ اپنا
وہی محبت وہی محبت کے غم پرانے

بستیاں دور بسانے والے کوئی دل سے نہیں جانے والے
جلنے والوں نے یہ دیکھا بھی نہیں کون تھے آگ لگانے والے
راہ میں چھوڑ گئے ہیں اکثر ہم سفر ہم کو بنانے والے
بن گئے ہیں مرا دامانِ خیال میرے خوابوں میں نہ آنے والے
لفظ تھے کاتبِ تقدیر کے ہم مٹ گئے ہم کو مٹانے والے
آسماں ہم پہ ہی ٹوٹا کہ ہمیں سر پہ تھے اِس کو اٹھانے والے
آگ تھی اپنی فغاں میں ایسی جل بجھے اِس کو بجھانے والے
اپنے کانٹوں کو چنیں گے کیونکر گل سے خوشبو کو چھڑانے والے
تختۂ دار پہ ہنس ہنس کے گئے تخت والوں کو رلانے والے

اتنا بے کیف ہے ماحول کرم
اٹھ گئے بزم سے، آنے والے

محبت بے سروساماں نہیں ہے سرو ساماں مگر درماں نہیں ہے
اندھیرے تیرتے پھرتے ہیں لیکن کہیں بھی چشمۂ حیواں نہیں ہے
ملے گی زندگی کیا اس کو جس پر نگاہِ گردشِ دوراں نہیں ہے
نہ پوچھو اب دلوں کے آئنوں کی وہی ٹوٹا ہے جو حیران نہیں ہے
جئیں کیونکر کہ مرنا بھی کسی پر ہمارے دور میں آساں نہیں ہے
لہو تو ہے بہت ارزاں ہمارا غنیمت ہے کہ دل ارزاں نہیں ہے
عیاں ہے مجھ سے جو پنہاں ہے مجھ میں مگر پہچان کچھ آساں نہیں ہے

پریشاں حال ہے گرچہ کرمؔ بھی
مگر منّت کشِ یاراں نہیں ہے

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

چہرہ اس کا ہرے بھرے بستانوں سا دل ہے لیکن چٹیل سخت چٹانوں سا
محفل محفل کل تک جس کی دھوم رہی گلیوں گلیوں آج پھرے دیوانوں سا
ایسا کوئی مل نہیں پایا رکھتا جو حسن فرشتوں جیسا دل انسانوں سا
بدلا ہے ہر رنگِ وفا ہر طرزِ جفا شمع رخوں کا حال ہے اب پروانوں سا
شیخ کو ہے اصرار کہ ہے تعمیرِ حرم شور شرابہ لیکن ہے میخانوں سا
اوپر اوپر اپنے گھر کے مالک ہم اندر اندر حال ہے کچھ دربانوں سا
مجھ سے زیادہ کس نے دیکھے دنیا میں چہرے مؤمن اور عمل شیطانوں سا

کارِ جہاں میں سخت ہے گو نادان کرمؔ
بھیس بنائے پھرتا ہے فرزانوں سا

تلاشِ آب و ہوائے بہار کیا کرتے
گھرے تھے آگ میں ہم خاکسار کیا کرتے

برہمنوں کی سیاست نے دم نہ لینے دیا
بتوں سے عہدِ وفا اُستوار کیا کرتے

دیئے تھے رنگ تو فطرت نے ہم کو بوقلموں
بندھے تھے ہاتھ تو نقش و نگار کیا کرتے

لپیٹنا ہی تھا اپنی برہنہ پائی کو
قدم قدم تھے نئے خارزار کیا کرتے

خود اپنی ذات پہ ہی اعتبار جب نہ رہا
کسی کے وعدوں پہ ہم اعتبار کیا کرتے

جسے طبیب بنایا اسیرِ زر پایا
علاجِ گردشِ لیل و نہار کیا کرتے

جو اپنے آپ کو دشتِ وفا میں کھو نہ سکے
وہ تن پرست دلوں کا شکار کیا کرتے

بدن دو لخت ہوا پھر بھی لب رہے خاموش
جہاں پہ زخمِ دروں آشکار کیا کرتے

ملا نہ جامِ مسرّت تو زہرِ غم ہی پیا
کہ تشنہ لب تھے بہت بے قرار کیا کرتے

شیں جوانی کی اختر شماریوں میں گئیں
دیئے جو داغ سحر نے شمار کیا کرتے

خیال تھا کہ وہ وعدہ وفا کرے گا کرمؔ
تمام عمر مگر انتظار کیا کرتے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

تعصبات نے اس طرح مجھ کو گھیرا ہے
کہ غیر سے بھی ہو سرزد تو جرم میرا ہے

منافقت کا لبادہ نہ جس پہ راس آیا
وہ جسم مجھ کو ملا تھا گناہ میرا ہے

برس رہے ہیں مرے دل پہ تیر پے در پے
کہ اس کی شاخوں میں ایمان کا بسیرا ہے

جو اپنی ذات کے اندھے کنوئیں میں لٹکے ہیں
سمجھ رہے ہیں کہ افلاک پر اندھیرا ہے

ادب تو ایک امانت ہے اے حریفِ سخن
اجارہ اس پہ نہ میرا ہے اور نہ تیرا ہے

قلم کشوں کا بھی ہوتا ہے سخت استحصال
زمینِ شعر پہ ایک اک بڑا وڈیرا ہے

کوئی بھبھوت رمائے کوئی لٹیں لٹکائے
نگارِ شہر کا گھر جوگیوں کا ڈیرا ہے

○

عمر ہے جنگل ہم ہیں شکار اور ظالم وقت شکاری ہے
دن تو جوں توں کٹ ہی گیا ہے رات کی منزل بھاری ہے

صدیوں سے ہر روز گرائے کیسے کیسے شاہ سوار
دنیا پھر ویسی کی ویسی اَلھڑ مست سواری ہے

اپنا آپ گنوا کر ہم نے پایا تو اتنا ہی پایا
برسوں کی محنت کے مقابل لمحوں کی غفلت بھاری ہے

بانہوں میں کس بل بھی بہت تھا دل میں ہمت قوت بھی
ہم نے ہوش حواس گنوا کر بازی اپنی ہاری ہے

بیچ بھنور ہے من کی نیّا، بے پروا بیٹھے ہیں کھوّیا
لہریں پاگل، دریا چھاگل، رین نپٹ اندھیاری ہے

خون سے خون کو دھونے والے نگر نگر ہیں میر وزیر
جن کا خون ہے پانی جیسا جان انہیں بھی پیاری ہے

عقل بغیر سیاست کرنا، عدل بغیر حکومت
کیا کیا اب اربابِ حرم کو دنیا میں دشواری ہے

کل تک جو بازاروں میں آوازیں لگائے پھرتے تھے
آج انہیں دیکھو تو ہر اک جیسے ہفت ہزاری ہے

اتنی کچھ گزران کے بعد اب جان عذاب میں آن پڑی
مر جانے کو جی نہیں مانے، جینے سے بیزاری ہے

خود بینی اب ایک وبا ہے کس کس کو سمجھائیں کرمؔ
اپنے آپ پہ عاشق ہونا سب سے بڑی بیماری ہے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

معرکے راہ تمنا کے بلا خیز رہے
دل کے جذبے بھی مگر اپنے بہت تیز رہے

دشت کیا شہروں میں بھی چلتی رہی بادِ سموم
پھر بھی اشجار محبت کے ثمر خیز رہے

کتنے دریاؤں کے دل چیر کے منزل پائی
کتنے گرداب تھے جو خون سے لبریز رہے

قافلے چھٹتے رہے پھر بھی ہراساں نہ ہوئے
جسم و جاں چور ہوئے پھر بھی قدم تیز رہے

کوہ کن کوہ گراں کاٹ کے آگے نکلے
اپنی شمشیریں سنبھالے ہوئے پرویز رہے

تن بدن جھلسے رہے دھوپ کی شدت سے مگر
ولولے دل میں رواں صورتِ کاریز رہے

ایک ننھا سا مرا دل کوئی اقلیم نہ تھا
گھات میں جس کی کرم کتنے ہی چنگیز رہے

ہم سا کوئی کب ہو گا زخموں کی طرح جس نے ہونٹوں کو سیا ہو گا
فریاد کی لہروں کو سینے کے سفینے میں زنجیر کیا ہو گا

ساقی نے دیا جو بھی وہ جام لیا ہم نے وہ زہر پیا ہم نے
یاروں نے مگر ایسا کب جام لیا ہو گا کب زہر پیا ہو گا

ہیں سب کے جداگانہ مرنے کے طریقے بھی جینے کے سلیقے بھی
لیکن رہِ الفت میں جو مر نہ سکا ہو گا وہ کیسے جیا ہو گا

اے میرے مسیحاؤ! کیوں ڈھونڈتے پھرتے ہو تم جسم پہ زخموں کو
اس کشتۂ الفت نے جو وار ہوا ہو گا وہ دل پہ لیا ہو گا

احوال وہی اپنے، بدلا ہے زمانہ کیا، سلجھا ہے فسانہ کیا
ہم جیتے ہیں اب جیسے، دنیا میں کوئی ایسے، مشکل ہی جیا ہو گا

میں چاند ستاروں میں پرواز نہیں کرتا لیکن یہ حقیقت ہے
طوفانِ حوادث میں جو بجھ نہ سکا ہو گا وہ میرا دیا ہو گا

میں کب سے دل ہی میں تم کو چُھپائے بیٹھا ہوں
لبوں پہ مُہرِ خموشی لگائے بیٹھا ہوں

یہ سوچ کر کہ تمہیں مجھ میں پا نہ لے کوئی
میں اپنے آپ کو گم سم بنائے بیٹھا ہوں

مرے قریب ہی تم ہو مگر نہ جانے کیوں
تمہاری یاد کو دل میں سجائے بیٹھا ہوں

میں جو بھی آئنہ دیکھوں تمہی نظر آؤ
اب اپنے آپ سے نظریں چُرائے بیٹھا ہوں

سخن کو پردۂ اظہار کر لیا میں نے
کہ لفظ لفظ کے معنی چُھپائے بیٹھا ہوں

بگاڑ تم سے گوارا جو ہو تو کیونکر ہو
میں تم کو اپنا مقدّر بنائے بیٹھا ہوں

تمہارا کام ہے آگے کہ لے چلو مجھ کو
میں کشتیاں سرِ ساحل جلائے بیٹھا ہوں

مرے سلگتے ہوئے لفظ کہہ سکیں شاہد
میں کیسی آگ کو دل میں دبائے بیٹھا ہوں

لگے ہے جیسے کسی کو نہیں خبر ہی کرمؔ
کہ میں بھی محفلِ جاناں میں آئے بیٹھا ہوں

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

○

کوئی بھی نالہ کسی پر اثر نہیں کرتا
اثر کرے بھی تو پہلو میں گھر نہیں کرتا

جلا کچھ ایسا زمانے کی سرد مہری سے
کہ دل سلگتا ہے رقصِ شرر نہیں کرتا

پہنچ گیا ہے خلاؤں میں چاند تاروں تک
خود اپنی ذات میں انساں سفر نہیں کرتا

کیا ہے بادیہ گردی نے خستہ جاں کیا کیا
مگر میں خواہشِ دیوار و در نہیں کرتا

وہ اپنے در پہ بلاتا اگر نہیں، نہ سہی
یہی بہت ہے مجھے در بدر نہیں کرتا

میں اس کے پیار کے دریا میں ڈوبنا چاہوں
مگر وہ لہروں کو اپنی بھنور نہیں کرتا

سمجھ میں آتا نہیں ہے معاملہ اس کا
وفا وہ کرنا بھی چاہے مگر نہیں کرتا

بنانا چاؤ سے خود، خود ہی توڑ بھی دینا
یہ کام تو کوئی آئینہ گر نہیں کرتا

بہت ہے ساقیٔ محفل کی یہ مروّت بھی
جو تشنہ لب ہیں انہیں تشنہ تر نہیں کرتا

کرم سا پاؤ گے کب کوئی چاہنے والا
کہ زخم زخم ہے اور شور و شر نہیں کرتا

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

○

قلب و نظر کی تنہائی اب قصّۂ راز و نیاز نہیں
دم ہے جیسے اپنا لبوں پر اور کوئی دمساز نہیں

روح کی جانب جو کھُلتے تھے اب وہ دریچے باز نہیں
کوئی جھونکا، کوئی خوشبو، کوئی حسیں آواز نہیں

سوئے جذبوں کو بھی جگانا اب تو کارِ محال ہوا
مردہ ضمیروں کو جو جِلائے ایسا کوئی اعجاز نہیں

دولت کی افیون پہ پل کر جو شہباز تھے بُوم ہوئے
پر بھی سلامت سر بھی سلامت ولولۂ پرواز نہیں

دل کی بات دبائے دل میں ہم پہ قیامت بیت گئی
جو ہمراز تھے پاس نہیں ہیں پاس جو ہیں ہمراز نہیں

سادہ دلانِ شہرِ وفا کو دونوں سے آزار ملے
عشق زمانہ ساز نہیں تھا عقل غریب نواز نہیں

کچھ خوش فکرے اب بھی فضا میں تانیں اڑائے پھرتے ہیں
ورنہ مطرب کون ہے ایسا جس کی رُندھی آواز نہیں

دل کے اندھے خواب فسانے، حسنِ حقیقت سے محروم
تلخیٔ غم ہے ایک حقیقت جس میں رنگِ مجاز نہیں

چوٹ لگے دل پر تو نغمے خود ہی پھوٹ نکلتے ہیں
جُز مضرابِ محبت کچھ بھی قیمت و قدرِ ساز نہیں

جانے اپنی صبحِ تمنا کس گرداب میں ڈوب گئی
یوں تو سب کہتے تھے کرمؔ سے غم کی رات دراز نہیں

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

○

زخم تو چار دن میں بھر جائیں پھر مگر چارہ گر کدھر جائیں
ان کی راتیں حسین ہوں کیسے دن ہمارے اگر سنوْر جائیں
کون پوچھے گا نا خداؤں کو گر چڑھی ندیاں اتر جائیں
کھول کر آنکھ کون دیکھے گا خواب جب تک نہ سب بکھر جائیں
ساحلوں پر بھنوْر ہوں جب اتنے اہلِ کشتی کہاں اتر جائیں
وہ ہیں جانِ جہاں انہیں غم کیا ہم جہاں میں جئیں کہ مر جائیں
منزلیں گم ہیں راستے ویران بے خبر راہرو کدھر جائیں
اب وہ موسم نہیں کہ بے آشوب اپنے دوچار دن گزر جائیں

دل ہیں یاروں کے اب سراب کرمؔ
ہم کہاں لے کے چشمِ تر جائیں

○

شب ستارے دیکھنا، دِن راہِ فردا دیکھنا
کب سے ہے اپنا مقدر یہ تماشا دیکھنا

چاند پر بھی ہم پہنچ جائیں تو پائیں خاک ہی
اپنی قسمت دیکھنا، اپنی تمنا دیکھنا

اس خرابے میں کہاں شادابیاں ہوں گی مگر
چار سو بہتے ہوئے آنکھوں کے دریا دیکھنا

ہو نہ ہو رازِ محبت فاش ہو جانے کو ہے
بزم میں دھندلا گیا اک رُوئے زیبا دیکھنا

لذّتِ پیہم کا باعث تھا مسلسل اضطراب
ہم نے خود چاہا نہ تھا آرام دنیا دیکھنا

کام آساں کر دیا ہے مرگِ بے ہنگام نے
ورنہ مشکل تھا بہت انجام اپنا دیکھنا

ساحلِ دریا پہ مجھ سے خضر نے ہنس کر کہا
ڈوب کر دریا میں تھا احوالِ دریا دیکھنا

ذہن سوئے تھے تو آنکھیں بجھ گئیں ورنہ یہاں
اَدھ کھلی آنکھوں سے بھی ممکن تھا دنیا دیکھنا

پھاندنے کو ہے کرمؔ انساں حدود کائنات
مُشتِ خاکِ ناتواں کے سر میں سودا دیکھنا

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

زباں پہ میری جو حرفِ سوال آجاتا
کسی کے چہرے پہ رنگِ ملال آجاتا

جلو میں اس کے جو ہوتے نہ ہم سے دیوانے
دیارِ عشق پہ دورِ زوال آجاتا

نگاہِ شوق جو ہوتی عنوروں کو نصیب
تو حرف حرف میں عکسِ جمال آجاتا

نہیں ہے غیر پہ لطف و کرم کا شکوہ مگر
کبھی ہمارا بھی اس کو خیال آجاتا

دل اس کے لہجے کی سختی کا تھا حریف کہاں
نہ ٹوٹتا بھی مگر اِس میں بال آجاتا

جھلک رقیبوں کو اُس کی نہ مل سکی ورنہ
سخن پہ اُن کے بھی اک خطّ و خال آجاتا

اُسے خبر ہی نہ تھی میرے حال کی ورنہ
کوئی پیام کرمؔ حسبِ حال آجاتا

○

قفس کو توڑا، تمنائے آشیاں سے گئے
ہم اس جہان میں رہ کر بھی اس جہاں سے گئے

عجیب رنگِ حریفانِ سفلہ خو دیکھا
کہ شعلہ شعلہ سے آئے دھواں دھواں سے گئے

خود اپنی ذات کی سدھ بدھ نہیں رہی باقی
ہم اب کسی کی محبت کے امتحاں سے گئے

روِش روِش خس و خاشاک کا تسلّط ہے
وہ گُل جو رشکِ بہاراں تھے گلستاں سے گئے

صلہ نہ جانے ہے کیا پاسداریٔ دل کا
کہ پاسداریٔ دل ہی میں ہم تو جاں سے گئے

ہم اپنے خونِ جگر کا حساب کیا کرتے
پلٹ سکے نہ ستارے جو کہکشاں سے گئے

ہوئے ہیں سایہ فگن اہلِ کارواں پہ وہی
جو ذرے اڑتے ہوئے گردِ کارواں سے گئے

وہی ہے عشق وہی اس کی طبعِ شور انگیز
وہی ہے حسن وہی اس کا غمزۂ خونریز

عجیب دور اداکاریوں کا آیا ہے
کہ ہو گئی ہے محبّت بھی مصلحت آمیز

نہ جانے فیصلہ کیا ہو حیاتِ شیریں کا
بنا ہے تیشۂ فرہاد مسندِ پرویز

یہ کس مقام پہ ہیں رہروانِ راہِ وفا
نہ بے رخی نہ تمنّا نہ جستجو، نہ گریز

اگرچہ آنکھ ہی تر ہے نہ لب ہی خشک مگر
درونِ سینہ رواں آنسوؤں کی ہے کاریز

جہادِ زیست میں کب ہوں گے صورتِ فولاد
وہ لوگ جن کے مقاصد جہاں میں ہوں زرخیز

اب بہارو خزاں سے کیا لینا　　باغ سے باغباں سے کیا لینا
جاں بھی جب تن سے اجنبی سی ہوئی　　تن سے کیا لینا جاں سے کیا لینا
خاک آلودہ ہے جبینِ نیاز　　رفعتِ آسماں سے کیا لینا
ہر کڑے امتحان سے گزرے ہیں　　اب کسی امتحاں سے کیا لینا
چھوڑ آئے جو داستانِ حسیں　　اُس حسیں داستاں سے کیا لینا
سنگِ تحریر تہہ میں جا ڈوبا　　نقشِ آبِ رواں سے کیا لینا
جب خموشی ہو متہائے سخن　　لبِ معجز بیاں سے کیا لینا
کشتۂ آتشِ فراق ہیں ہم　　قربِ سیمیں تناں سے کیا لینا
جب اسیرِ مکاں ہی ہم ٹھہرے　　وسعتِ لامکاں سے کیا لینا
آگئی منزلِ رضا آخر　　کام آہ و فغاں سے کیا لینا

دل ہی دھندلا رہا ہے اپنا کرمؔ
آب و رنگِ بتاں سے کیا لینا

جو مزاجِ ابنِ آدم ذرا استوار ہوتا
نہ سبک فلک پہ ہوتا نہ زمین پہ بار ہوتا

کسی کام کا جو اپنا دلِ نابکار ہوتا
تو ہجومِ عاشقاں میں سرِکوئے یار ہوتا

نہ طلب نہ کچھ جنوں ہے یہ سکوں بھی کیا سکوں ہے
کوئی دشتِ شوق ہوتا کوئی خارزار ہوتا

جو ازل سے تھے پرائے انہیں ہم سمجھ نہ پائے
یوں نہ لخت لخت ورنہ دلِ بے قرار ہوتا

یہی کم نصیبیاں تھیں اپنی کہ ملی نہ من کی دنیا
نہ خزاں کا دور آتا نہ غمِ بہار ہوتا

وہ نظر سے کب نہاں تھا جو مقیمِ جسم و جاں تھا
کوئی پردہ ہی کہاں تھا جو وہ آشکار ہوتا

یہ ستم زمانے بھر کے یہ کرمؔ کی جانِ تنہا
اُسے کاش دل پہ اپنے کوئی اختیار ہوتا

لخت لخت

لب بستگی کو جرأتِ اظہار کر گئی
کیا چیز شاخِ نغمہ کو تلوار کر گئی

چمکی اس اہتمام سے برقِ جمالِ یار
صورت گروں کو نقش بدیوار کر گئی

اتری تو تھی ہمارے چمن میں بھی چاندنی
کلیاں کھلی نہ تھیں کہ افق پار کر گئی

☆ ☆ ☆

میں کوئی یوسفِ کنعاں نہیں کہ چاہ میں ہوں
تو جس طرف سے بھی آئے گا تیری راہ میں ہوں

ملا ہزاروں کو آرام چھاؤں میں میری
کہ میں بھی اک شجرِ سایہ دار راہ میں ہوں

☆ ☆ ☆

پہلے بھی غم بہت تھے مگر رایگاں نہ تھے
بے صرفہ آنسوؤں کے یہ دریا رواں نہ تھے

تھی اِک نگہ تسلیٔ دل کے لئے بہت
وہ اس قدر بھی ہم پہ مگر مہرباں نہ تھے

اپنے سوا کسی کا جلایا نہ ہم نے دل
آتش بجاں ضرور تھے آتش زباں نہ تھے

☆ ☆ ☆

مشقِ ستم کی پھر کوئی تدبیر کیجئے
جرمِ وفا کو قابلِ تعزیر کیجئے

یاد آئے اپنے نیند کے ماتوں کو اور خواب
یا خوابِ دوش کی کوئی تعبیر کیجئے

گہرے سمندروں کا شناور ہے کیوں کرمؔ
ساحل پہ اس کو حلقہ بہ زنجیر کیجئے

☆ ☆ ☆

ہم سخن سازوں کے انداز نہیں جانتے ہیں
وہی کہتے ہیں جسے عین یقیں جانتے ہیں

سر پر افلاک کی چادر تو تنی ہے سب کے
جس کی آغوش میں ہیں ہم وہ زمیں جانتے ہیں

قوتیں سارے زمانے کی ہیں پنہاں اس میں
لوگ جس چیز کو اک قلبِ حزیں جانتے ہیں

☆ ☆ ☆

اب ہمیں ہم ہیں اور غم اپنے رابطے ہو گئے ہیں کم اپنے
کیا گلہ غیریت کا اوروں سے خود ہی جب ہو سکے نہ ہم اپنے
کب خدا کا ہمیں خیال آیا ہو گئے جب خدا صنم اپنے
ہم نے منزل اسی کو جان لیا رک گئے ہیں جہاں قدم اپنے

کھول کر دل جو آ ملے کوئی پھر نہ شکوے نہ ہوں گلے کوئی
اے نسیمِ بہار تھم کے ذرا زخم دل کا نہ اب چھلے کوئی
داد کی تو کہاں مجھے امید میری فریاد سن ہی لے کوئی
شاخ تا شاخ دستِ گلچیں ہے پھول کیا سوچ کر کھلے کوئی

☆ ☆ ☆

ایک درد آشنا نہیں ملتا ورنہ دنیا میں کیا نہیں ملتا
پہلے ملتا نہ تھا سفینہ مجھے اب کوئی ناخدا نہیں ملتا
کارواں راستوں میں بکھرے ہیں منزلوں کا پتا نہیں ملتا
پھر اسی بے وفا سے ملتے ہیں جب کوئی دوسرا نہیں ملتا

☆ ☆ ☆

اب نہ وہ شوخیٔ رفتارِ صبا باقی ہے
نہ وہ غنچوں میں سمٹنے کی ادا باقی ہے
بلبلیں درد کے صحراؤں میں روپوش ہوئیں
ایک دل ہے کہ سرِ راہِ وفا باقی ہے

جو ہو سکے تو کسی دل میں گھر کرے کوئی
خود اپنی ذات میں کب تک سفر کرے کوئی

نصیبِ دار ہی آخر جو اس کو ہونا ہے
تو کس خوشی میں تمنائے سر کرے کوئی

کتابِ زیست کی زرّیں ورق بھی ہو جائے
لہو کو اپنے اگر آبِ زر کرے کوئی

☆ ☆ ☆

جذبۂ شوق کو عُریاں نہیں ہونے دیتا
غمِ جاناں کو غمِ جاں نہیں ہونے دیتا

عشق کو دیتا ہے اس طرح سے تعلیمِ وفا
اپنی آواز بھی عُریاں نہیں ہونے دیتا

اپنے غم میں تو رلاتا ہے مجھے آٹھ پہر
میرے غم میں مجھے گریاں نہیں ہونے دیتا

☆ ☆ ☆

ایک دو دن کی زندگی کے لئے | ہم نے احسان ہر کسی کے لئے
جیسے ہر آگ میں جلے کوئی | چند لمحوں کی روشنی کے لئے

☆ ☆ ☆

ایک اٹھاؤں تو ایک اور ملے | پردہ ہائے حجاب ہیں کتنے
کچھ بتا اے نگارِ آزادی | تیرے رُخ پر نقاب ہیں کتنے

☆ ☆ ☆

دیکھ کر مقتلِ محبّت کو | دل تماشائیوں نے تھام لئے
کِس کو لیکن یقین آئے گا | ہم نے جب قاتلوں کے نام لئے

☆ ☆ ☆

چکھ بھی سکتا نہ تھا جنہیں کوئی | زہر کے ہم نے ایسے جام پئے
ہاں مگر اے نگارِ آزادی | سب کے سب لے کے تیرا نام پئے

☆ ☆ ☆

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

جب حوادث کے تند جھونکوں سے | دل کے ہنگامے سرد ہو جائیں
ذہن رہ جائیں منجمد ہو کر | جسم آوارہ گرد ہو جائیں
تب عجب کیا جو تج کے شہروں کو | لوگ صحرا نورد ہو جائیں

☆ ☆ ☆

رات جب دُور کے جزیروں سے | وسوسوں کے جلو میں آتی ہے
ظلمتوں کے دبیز پردوں میں | روح بے طرح تلملاتی ہے
کس کی آواز چاندنی بن کر | دل کے آنگن میں پھیل جاتی ہے

☆ ☆ ☆

ہم تو گویا تھے بے زبان شجر | سنگ کھاتے ثمر کھلاتے رہے
آئے کتنے یہاں ثمر بردار | جو ثمر بیچ بیچ کھاتے رہے
اور جاتے ہوئے زراہِ کرم | ٹہنیوں کو بھی کاٹ جاتے رہے

☆ ☆ ☆

سخت ہے نشۂ جہانبانی | سخت اس کا مگر اتار بھی ہے
اوج ہی اوج پر ہو جن کی نظر | ان کے رستے میں اوجِ دار بھی ہے

☆ ☆ ☆

جو سیاست کی سطح پر چمکے | وہ ستارے تھے تابناک بہت
ٹوٹ کر جب گرے تو یہ دیکھا | ان میں جوہر تو کم تھا خاک بہت

☆ ☆ ☆

یا بوجہ فساد مارا گیا | یا زِ روئے عناد مارا گیا
زندگی کس طرح بحال رہے | جذبۂ اعتماد مارا گیا

☆ ☆ ☆

اے شراروں سے کھیلنے والو | آگ کب دوستی نبھاتی ہے
سو برس پُوجتا رہے جو اسے | ایک پل میں اسے جلاتی ہے

☆ ☆ ☆

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ
PAKISTANIPOINT
ایک رابطہ اپنوں سے
پاکستانی پوائنٹ

ہم فقیرانِ راہ کیا جانیں | کیا رہ و رسمِ شہر یاری ہے
ہاں سنا ہے کہ شور گلیوں کا | شہر یاروں پہ سخت بھاری ہے

☆ ☆ ☆

کس کا آئینہ یک بیک ٹوٹا | کس کی تصویر پاش پاش ہوئی
تیرے قدموں پہ اے بُتِ پندار | دیکھ تو سرد کس کی لاش ہوئی

☆ ☆ ☆

نیلِ رقصاں ہے موج موج ابھی | کتنے فرعون آئے ڈوب گئے
کھیل ہے دھوپ چھاؤں کا دنیا | دھوپ اتری تو سائے ڈوب گئے

☆ ☆ ☆

ہم بھی شاہوں کے عُذر خواہ نہیں | شاہ کب بے گناہ ہوتے ہیں
ہم ہیں مارے ہوئے مگر ان کے | جو فقیروں سے شاہ ہوتے ہیں

☆ ☆ ☆

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

اے فقیہانِ شہر کچھ تو کہو | کس کا ایمان آج خالص ہے
مدعی تم ہو اور ہم ملزم | تیسرا کون ہے جو ثالث ہے

☆ ☆ ☆

ہو رہا ہے اب اس طرح محسوس | ہم ہی گویا جہاں شناس نہ تھے
دل اُنہیں ہم نے اپنا دے ڈالا | جو ہمارے زباں شناس نہ تھے

☆ ☆ ☆

رُت بہاروں کی گر طویل نہ تھی | دِن خزاں کے بھی مختصر ہوں گے
اپنی مٹّی سے کٹ گئے جو مگر | وہ شجر کیسے بارور ہوں گے

☆ ☆ ☆

فرد جانِ معاشرہ تھا کبھی | قوم تھی فرد فرد پر نازاں
رفتہ رفتہ مگر یہ حال ہوا | دونوں اک دوسرے سے ہیں نالاں

☆ ☆ ☆

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

جسم ملّت کا زخم زخم ہوا | ایک سے ایک زخم ہے کاری
پھر بھی آنکھیں ہیں خشک لب خاموش | جیسے ذہنوں پہ نیند ہو طاری

☆ ☆ ☆

فخر تھا مؤمنوں کو اس پہ کبھی | کس نے کتنے کئے غلام آزاد
اب ہے اِس پر کہ کس نے کتنے بنائے | اور کتنوں کو کر دیا برباد

☆ ☆ ☆

دل کو کب تک لہو رلایا جائے | موت پر کیوں نہ مسکرایا جائے
مرگ انبوہ جشن ہے تو کرم | اب کے یہ جشن ہی منایا جائے

☆ ☆ ☆

تن ہوئے زخم زخم یاروں کے | لب پہ ہر ایک کے دُہائی ہے
پوچھنا ہے مگر مجھے اِن سے | چوٹ دل پر بھی کوئی کھائی ہے

☆ ☆ ☆

پاکستان ورچوئل لائبریری
www.pdfbooksfree.pk

وہ جو بے وقت بول اٹھتے ہیں | ان پہ اکثر عتاب ہوتا ہے
جو مگر وقت پر رہیں خاموش | ان پہ نازل عذاب ہوتا ہے

☆ ☆ ☆

آسماں کو خبر کہاں ان کی | گل یہاں جو کھلائے جاتے ہیں
چند ذرّوں کے جگمگانے کو | کتنے سورج بجھائے جاتے ہیں

☆ ☆ ☆

پہلے صدیوں کے فاصلوں پہ کہیں | جا کے ملتے تھے عاد اور ثمود
اب یہ عالم کہ جس طرف دیکھیں | کوئی فرعون ہے کوئی نمرود

☆ ☆ ☆

کیا خبر تھی کہ دورِ آخر میں | آدمی اس قدر شقی ہوں گے
مسندیں جن کی ہوں گی لاشوں پر | وہ محبّت کے فلسفی ہوں گے

☆ ☆ ☆

مسندیں ناز کی سجائے ہوئے | واعظ و شیخ و پیر بیٹھے ہیں
ان سے ملئے تو یوں لگے جیسے | آسماں کے سفیر بیٹھے ہیں
یا فرشتے ہیں بھیس بدلے ہوئے | یا خدا کے وزیر بیٹھے ہیں

☆ ☆ ☆

حرف و لفظ و بیاں ہوئے بے بس | خستہ حالی سی خستہ حالی ہے
کس کو منعم کہیں کسے مخدوم | جس کو پوچھو وہی سوالی ہے
چشمے آنکھوں کے سب کے ہیں لبریز | جامِ دل ہر کسی کا خالی ہے

☆ ☆ ☆

جو خِرد مند ہوں خِرد پر ہی | اُن کا دارومدار ہوتا ہے
دست و بازو ملیں جنہیں اُن کو | دست و بازو سے پیار ہوتا ہے
جن کو کچھ بھی نہ ہو نصیب اُن کا | نعرہ بازی شعار ہوتا ہے

☆ ☆ ☆

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ایک ہوں جب دل و زباں باہم | آدمی کا کوئی جواب نہیں
جس کی لیکن زباں ہو دل سے جُدا | اُس سا پھر خانماں خراب نہیں

☆ ☆ ☆

ناز کرتا ہے اپنی دانش پر | تیغ کو شاخِ گُل سمجھتا ہے
جو بھی مسند نشین ہو جائے | خود کو وہ عقلِ کُل سمجھتا ہے

☆ ☆ ☆

بحث میں قیل و قال میں خوش ہیں | کھیل میں سُر میں تال میں خوش ہیں
زیست میں جو ہنر ہیں لا حاصل | ہم انہی کے کمال میں خوش ہیں

☆ ☆ ☆

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

رات

اقبالِ خور تمام ہوا آگئی ہے رات | مستور اک ردائے سیہ میں ہے کائنات
زیر نگیں جو تھیں شہِ مشرق کے شش جہات | انجم پہ بسکہ تنگ رہا عرصۂ حیات

اب پھر سپوت مادرِ شب کے جواں ہوئے
خلوت کدوں سے نکلے فلک پر عیاں ہوئے

آغوشِ شب میں غول ستاروں کا جب بڑھا | غیرت سے ایک کرمکِ شب بھی چمک اٹھا
کہنے لگا کہ مجھ کو بھی بخشی گئی ضیاء | اتنے میں گرم ہو کے چراغوں نے یہ کہا

ہم نے کیا ہے محملِ لیلائے شب کو چاک
دعویٰ ہے یہ ہمیں بھی کہ ہم بھی ہیں تابناک

اِک صاحبِ نظر نے جو دیکھا یہ ماجرا | عبرت کا تازیانہ سا دل پر اسے لگا
پیشِ خدائے پاک وہ سجدے میں گر پڑا | باچشم نم پکارا کہ اے ربِّ دوسرا

خورشید کے زوال سے تاروں کو ہے عروج
مرجھا گئے جو پھول تو خاروں کو ہے عروج

مومن کہ اس جہاں میں تھا خورشید کا مثیل | تھی جس کی ذات مشرق و مغرب میں بے عدیل
تھی جس کی سروری میں کسی کو نہ قال و قیل | تھا خود ہی اپنی ہستیٔ بے مثل پر دلیل

ہے اب کہاں وہ نورِ نبوّت کا آفتاب
یہ آفتاب جس کے مقابل تھا اک حجاب

جس کی چمک سے کون و مکاں تھے فروغ گیر | ایران و چین و اندلس و یونان مستنیر
گاہے بہ روم جلوہ فگن گہ بہ کاشمیر | تھے بحر و بر نجوم و قمر جس کے سب اسیر

عالم تمام جس کی نگاہوں میں پست تھا
سب سے بلند اپنی تجلّی میں مست تھا

اب رات آگئی ہے جو آیا اُسے زوال | وہ سطوت و جلال ہوا خواب یا خیال
تاروں کو اور شراروں کو حاصل تھی کیا مجال | اب ہیں بہ زعمِ خویش وہی صاحبِ کمال

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

یہ آفتاب کل بھی تو ہو گا فلک نشیں
وہ آفتاب بھی کبھی ابھرے گا یا نہیں

آئی ندا کہ تیری صدا ہے متاعِ سوز | فطرت کبھی ہوئی نہ کبھی ہو گی کینہ توز
فطرت تو ہر کسی کی ہے دلدار و دلفروز | فطرت وہی ہے گرچہ جدا روز سے ہے روز

گوہر میں آب کم ہو تو اک سنگ پارہ ہے
خورشید بے تپش ہو تو بجھتا شرارہ ہے

خنجر ہے آب سے جو نہ ہو آب کچھ نہیں | گرجام میں نہیں ہے مئے ناب کچھ نہیں
دریا کہ ہو چکا ہو جو پایاب کچھ نہیں | کھائے نہ پیچ و تاب تو گرداب کچھ نہیں

جو زندگی ہے سوزو گداز و تپش سے ہے
اس دہر میں عروج عمل کی روش سے ہے

ذروں کے اتحاد سے پیدا ہو آفتاب | قطرے اگر ملیں تو بنے بحرِ بے حساب
کنکر اگر اٹھیں تو ہمالے کو دیں جواب | ہوں چند دل جو ایک تو برپا ہو انقلاب

اللہ کو جو خود بھی ہے نفرت فساد سے
قوموں کی آبرو ہے فقط اتحاد سے

۱۹۳۹ء

اے دیدۂ خونناب بار

کھول کر دل رو یہاں اے دیدۂ خونناب بار
یہ جہاں اب بن گیا مہر و مروّت کا مزار

کر دیا ہے علم نے انساں کو ابلیس آشنا
بن گیا ہے نور آکر خاک کے پتلے میں نار

مِل گیا اس دور میں شیطاں پرستی کو عُروج
اور ہے انسانیت کا دامنِ دِل تار تار

عقل جتنی بیش ہے اُتنی سراپا نیش ہے
دیکھ کر دل ہے غریقِ گریۂ بے اختیار

ہیں نہنگانِ ہوا و حِرص منہ کھولے ہوئے
دیکھئے کیا ہے رضائے قدرتِ پروردگار

ڈالتے ہیں ان پہ اصحابِ سیاست دان راکھ
اور آمادہ بھڑک اٹھنے پہ ہیں ہر دم شرار

کیا عجب ہے گر رگِ غیرت پھڑک اٹھے کوئی
گردنِ مزدور پر ہے خنجرِ سرمایہ دار

چشمِ بینا منتظر بہرِ تماشائے دگر
زود بینی محملِ گیتی یہ لیلائے دگر

۱۹۳۹ء

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

تلوار

آ تجھ کو چوم لوں کہ تو ہی میری جان ہے تحریر تجھ پہ ہی مری دیرینہ شان ہے
دستِ رسولِؐ پاک کا تجھ پر نشان ہے اور بازوئے حسینؓ کی تو رازدان ہے
آتی ہے تجھ سے خالد و طارق کی بو مجھے
میرے سلف کی یاد دلاتی ہے تو مجھے

وہ دن بھی یاد ہیں کہ تو میری کمر میں تھی میری رفیق دشت و جبل بحر و بر میں تھی
تاب و تواں جو تجھ سے مرے بال و پر میں تھی ذرّہ مثال وسعتِ دنیا نظر میں تھی
میں چھا رہا تھا سارے جہاں پر سحاب وار
پہلو میں میرے تو تھی فضاؤں میں برق بار

میدان میں بڑھا جو میں تجھ کو علم کئے سرکش تمام راہیٔ ملکِ عدم کئے
اپنے قدم عرب سے جو سوئے عجم کئے سرہائے مجز قیصر و کسریٰ نے خم کئے

عالم تمام میری نگاہوں میں گرد تھا
مجھ سا نبردِ پیشہ بھلا کون مرد تھا

تو منبعِ حیات ہے تو مایۂ حیات قرانِ ہست و بود کی تو آیۂ حیات
اونچا بجھی سے دہر میں ہے پایۂ حیات تجھ بن حیات کیا ہے فقط سایۂ حیات
تو جس کسی سے پھیر کے آنکھیں پلٹ گئی
اس بے نوا غریب کی دنیا الٹ گئی

ناموسِ مرد، عصمتِ زن تجھ سے بے الم خائف ہے تجھ سے دیوِ قوی پنجۂ رستم
تو ہے رفیقِ ملکِ عرب، حافظِ عجم تو ہے امینِ دولتِ آزادیٔ اُمم
تو پاسدارِ باغِ تمدن نہ ہو اگر
ہو جائے چند روز میں ویراں یہ سر بسر

آبِ حیات سے تو ہوا خضر شاد کام لیکن لیا سکندرِ دانا نے تجھ کو تھام
جو تیری آب میں ہے حقیقی ہے وہ دوام ورنہ وہ زیست کیا جو عناصر کی ہو غلام
بیچارہ خضر واقفِ غم صبح و شام ہے
اہلِ جہاں کے لب پہ سکندر کا نام ہے

شاہیں کو چنگِ تیز سے ہے عزّ و افتخار اور یہ نہ ہو تو زاغ و زغن میں ہو وہ شمار
پنجے سے اپنے شیر کو حاصل ہے اعتبار پنجہ ضعیف ہو تو ہے روباہِ فتنہ کار

شاہیں کو چنگ شیر کو پنجے سے آبرو
اور آبروئے مرد کی ضامن جہاں میں تو

اب ڈر رہا ہے تجھ سے مسلمان حیف ہے پہچانتا نہیں تجھے نادان حیف ہے
گو دولتِ جہاں کا بھی نقصان حیف ہے تجھ بن لٹائے بیٹھا ہے ایمان حیف ہے

تلوار اور کتاب یہ اُس کی اساس تھی
لیکن کتاب جب تھی کہ تلوار پاس تھی

دیکھی جو اب فرنگی سیاست کی ہاؤ ہو کی دل سے محو آیۂ فرمانِ جاھدوا
اس کی مماقتوں کے چڑھائے ہیں سب سبو پیدا ہوئی نہ دل میں مگر اِس کی جستجو

مردِ فرنگ بزم میں جو نغمہ ریز ہے
جب رزم گاہ میں ہو تو کیوں تندو تیز ہے

اے کاش دے یہ کوئی مسلمان کو پیام اے تلخ کامِ گردشِ ایامِ بے مقام
جنت ہے کب حلال جو دنیا ہوئی حرام بن گوشِ ہوش سے کہ نبیؐ کا ہے یہ کلام

ہوتا ہے جس طرح سے کہ گُل خار کے تلے
جنّت اسی طرح سے ہے تلوار کے تلے

بہار

دستِ خزاں سے دامنِ گلشن تھا تار تار
کوہ و دمن میں صورتِ وحشت تھی آشکار

بہمن نے چھین لی تھی ہر اک سے قبائے سبز
عریانیوں سے تھے سبھی اشجار سوگوار

سرد و سمن پہ قہرِ بلا تھی ہوائے سرد
دل ان کے بے قرار تھے تن ان کے تھے فگار

چنگیزِ ذے نے خاک میں ہر گُل مِلا دیا
تھا اس کی چشمِ کور پہ ہر جلوہ ایک بار

سہمے ہوئے پڑے تھے عنادل کسی طرف
تیغِ خزاں کا حیف ہوا ان پہ کیوں نہ وار

باقی تھا اُن کے عشق کا شاید کچھ امتحاں
محبوب کا فراق تو تھی ابتدائے کار

سبزہ تھا سخت جان کہ پامال ہو چکا
لیکن تھا اب بھی آئنہ دارِ بہارِ پار

صحنِ چمن سے محفلِ گُل یوں گریز پا
صیاد سے ہو جیسے رماں آہوئے تتار

بالائے سرو قُمریٔ رنگیں نوا نہ تھی
پابوس کو نہ بڑھتی تھی اٹھ اٹھ کے جویبار

لیکن یہ کون آج گلستاں میں آگیا
جس نے روش روش کو دیا ہے نیا نکھار

ہر ذرّہ آفتاب سے بڑھ کر چمک اٹھا
خوشبو سے گوشہ گوشہ چمن کا مہک اٹھا

پھر جوشِ گل وہی، وہی بلبل کا سوزو ساز
پھر شاہدِ چمن نے بچھائی بساطِ ناز

پھر قمریوں نے کی ہے صدائے طرب بلند
پھر ہے نوائے بلبلِ مستانہ دلنواز

مرغانِ خوش گلو کے ترانے ہیں نرم خیز
جیسے جھڑے ہوں چار طرف ہلکے ہلکے ساز

غنچے جو مسکرا کے اُنہیں دیکھنے لگے
فرطِ حیا سے اوڑھی گلوں نے قبائے ناز

ندّی کو پھر یہ سوجھی کہ اٹھکیلیاں کرے
کرنے لگی ہے دستِ ہوس ہر طرف دراز

باد صبا نے چوم کے کھولی کلی کی آنکھ
بلبل کے واسطے درِ توبہ ہوا ہے باز

بطنِ صدف میں قطرۂ نیساں گہر ہوا
موجوں نے فاش کر دیا اٹھ کر یہ سب پہ راز

آئی ہے عید بلبل و درّاج و سار کی
یعنی سحر ہوئی ہے شبِ انتظار کی

رونق جہاں کی مردِ مجاہد کے دم سے ہے
ہے جو بہار اس کے ہی فیضِ قدم سے ہے

ذرّوں میں ہے چمک تو اسی کی نگاہ سے
پھولوں میں ہے مہک تو اسی کے کرم سے ہے

سیراب ہے اسی کے لہو سے چمن چمن
مٹّی میں رنگ و نور اسی آب و نم سے ہے

ہے اس کے صدقِ طبع گہر زا کا یہ اثر
سنگ و خزف میں بڑھ کے صفا جام جم سے ہے

ہر ذرہ خاک کا شہِ مشرق سے داد خواہ
ہر قطعہ پر گماں ہے کہ باغِ ارم سے ہے

مطلب ہے سعیِ پیہم و جہدِ تمام سے
سود و زیاں سے کام نہ کچھ بیش و کم سے ہے

شوقِ نمود و ذوقِ نمائش سے برکنار
رغبت نہ تخت و تاج نہ جاہ و حشم سے ہے

معراجِ خوش نصیبیِ بندہ ہے بس یہی
وہ بہرہ ور جو آقا کے لطف و کرم سے ہے

کچھ مل گیا ہے زندگیٔ مستعار کا
شبنم کو کیا حصول ہے ورنہ فرار کا

انفعال

چمن سے دور بہت دور کُنجِ صحرا میں لطیفہ سازیٔ فطرت سے ایک پھول کھلا
نہ گدگدایا نسیمِ چمن نے جس کو کبھی جسے نہ بادۂ آبِ رواں کا جام ملا

اُسے یہ ناز کہ صحرا مجھی سے روشن ہے کہ اس وسیع دھندلکے میں اک چراغ ہوں میں
مرے وجود سے مستی ہے ذرّے ذرّے میں کہ تابہ حدِ نظر ایک ہی ایاغ ہوں میں

نہ جانے کیسے فضا قہقہوں سے گونج اٹھی ہوا اڑا کے گلستاں میں اُس کو لے آئی
قدم قدم پہ جہاں تھے نئے نئے جلوے کلی کلی میں چھلکتا تھا جامِ رعنائی

ہجوم لالہ و گل میں وہ پھول بیچارا وفورِ شرم سے بحرِ خیال میں ڈوبا
ندامت اتنی ہوئی بیچ مایگی پہ اسے کہ سر بسر عرقِ انفعال میں ڈوبا

۱۹۴۲ء

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

کردارِ اوّل

ساحرِ انگلیس

ہر خاک کا پُتلا ہے مرے سحر سے مسحور
اقوام مرے سامنے ہیں عاجز و مجبور

انسان ہے کیا میں تو ہوں خورشید کا ہم چشم
آفاق کے ہر گوشے میں پھیلا ہے مرا نور

رقصاں ہیں اشارے پہ مرے مشرق و مغرب
جیتے ہیں سہارے پہ مرے شہپر و عصفور

ہے مست نفیری پہ مری مار ہو یا مور
خوش مجھ سے ہے زردار فدا مجھ پہ ہے مزدور

مشرق میں ہوں تہذیبِ فرنگی کا علمدار
مغرب میں ہوں تعلیمِ مساوات پہ مامور

دولت مری باندی ہے حکومت مری لونڈی
پلتے ہیں مرے سائے میں سو قیصر و فغفور

بل لاؤں جو ابرو پہ تو آجائے قیامت
قدرت کو وہ منظور ہے جو مجھ کو ہے منظور

ادراک کے آئینے میں ہے مجھ پہ عیاں سب
کیا غم ہے اگر لوح و قلم مجھ سے ہیں مستور

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

بے چارہ وہ دیوانۂ المان کہ مجھ سے
اس زعم میں الجھا ہے کہ تیار نہیں میں

گل چینوں کو اکثر گلِ تر کا ہوا دھوکا
محسوس خلش جس کی ہو وہ خار نہیں میں

شاہد ہیں مرے جان نثاروں پہ مہ و مہر
یہ کس نے کہا ہے کہ وفادار نہیں میں

ہے ہند میں جس "حکمتِ مجبور" کا چرچا
اس جامِ سفالیں کا خریدار نہیں میں

اس دہر میں ہر ایک کا ہے اپنا مقدر
منصور بھی ہوں اور سرِ دار نہیں میں

عشرت کدۂ شوق میں گو فرد بھی ہوں میں
ہو جنگ کا ہنگامہ تو پامرد بھی ہوں میں

ے Passive resistance

کردار دوم

دیوانۂ آلمان۔

کوئی اہلِ انگلیس سے جا کے کہہ دے — بہت بڑھ چکیں جب تو مٹتے ہیں سائے
کہاں ہے کلیمنشیو۔ کا وہ دم خم — ذرا آنکھ تو آکے مجھ سے ملائے
یہودی ہے اقوامِ عالم کا دشمن — یہودی کے فتنے سے مولا بچائے
"چھپا دستِ ہمّت میں زورِ قضا ہے" — مقابل مرے جس کی ہمّت ہو آئے
ملا دوں میں انگریز کو خاک و خوں میں — یہ تنگ آبنائے گرنہ اس کو بچائے
ذرا دیکھ تو کس طرح بڑھ رہے ہیں — وہ فتنے جو مشرق میں اس نے اٹھائے
تقاضا ہے یہ اس کی نمرودیت کا — کہ جو بت شکن ہو اسے وہ جلائے
مگر توڑ دوں گا میں اس کے بتوں کو
مری جان بھی اس میں جائے تو جائے

۔ Herr Hitler

۔ فرانس کا وزیراعظم جس نے پہلی جنگ عظیم کے بعد اپنے بوٹ کی ایڑی سے یورپ کا نقشہ بنایا تھا۔

مزدکِ ثانی

پھیر دیتے ہیں رخِ ایّام کو مردانِ کار
پھیر دے بڑھتی ہوئی موجوں کو جیسے کوہسار

قطرہ ہو موجِ طہور اور ذرہ ہو سیلابِ نور
یہ بھی ممکن ہے جو ہو سوزِ عمل سرگرمِ کار

ننگ ہے انساں کو انساں کی غلامی ننگ ہے
بار ہے تختِ ملوکیّت زمیں پر ایک بار

وائے ہر وہ قوم جس میں ہو خودی مرہونِ زر
وائے ہر وہ ملک جس کا ہو خدا سرمایہ دار

تو نے دیکھا سرزمینِ روس پہ سیلِ جمود
نوح کے طوفان کا ہوتا تھا جس پر اعتبار

دیدنی تھا زار شاہی میں ہمارا حال بھی
گوشِ ہر حق کوش میں آتی تھی جب دل سے پکار

"بھاگ اِس اجڑے گلستاں سے مثالِ بوئے گُل
توڑ دے اس رشتۂ پارینہ کو آئینہ وار"

ہیں زن و زر اصلِ ہر فتنہ و لیکن آدمی

کھا چکا ہے ٹھوکریں نامِ خدا پر بار بار

روح و جسم و ابتدا و ماورائے زندگی
کیوں الجھتے ہیں تیرے دامن سے آ آ کر یہ خار

بندہ تو مولا بھی تو بت گر بھی تو اور بت بھی تو
راکھ سے اپنی چمک اٹھتا ہے تو مثلِ شرار

اپنی کشتی آپ طوفان سے بچا گر زندہ ہے
ناخدا ہو یا خدا سنتا نہیں تیری پکار

توڑ دے نادان دیرینہ سلاسل توڑ دے
ورنہ تیری راہ ہے تار و طویل و خاردار

آج جس کے ہاتھ ہے کل بھی اسی کے ساتھ ہے
فکرِ فردا چھوڑ کر امروز اپنا استوار

خونِ گرمِ باغباں سے آبیاری شرط ہے
دہر میں ممکن ہے ہر اجڑے گلستاں پر بہار

مٹ نہیں سکتا کسی صورت نظامِ مزدکی
پٹ نہیں سکتے پیادوں سے ہمارے شہسوار

ہم نے اہلِ قوم کو دی وہ شراب تُندوتیز
اُن کے سر جب تک سلامت ہیں نہ اترے گا خمار

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

کردار چہارم

باربُدِ سیزر

آتشِ شوق اب مری ہوتی رہے گی تیز تر
سال بہ سال مہ بہ مہ، روز بروز دم بدم

طبعِ جواں پہ بار ہے جبرِ مصالحِ خرد
آگے بڑھا کے عار ہے پیچھے ہٹایئے قدم

سیل بھی رُک سکا کبھی! کوہ بھی جُھک سکا کبھی!
لاکھ کوئی لگائے بند، لاکھ کوئی نکالے خم

لے کے جو عزم آہنیں گھر سے نکل کھڑے ہوئے
راہ میں سنگ ہوں کہ خار اس کا ہمیں نہیں ہے غم

اہلِ فرنگ کو دیا ہم نے ہی درسِ زندگی
کوئی بتائے اب چلیں اُن کے عقب میں کیسے ہم

شاہرہِ حیات میں خون ہمارا ہے رواں
بحر بہ بحر، جو بہ جو، موج بہ موج یم بہ یم

تازہ ہوا ہے پھر جنون، جوش میں آگیا ہے خوں
دشت ہو ریگ زار ہو اب نہ کہیں رکیں گے ہم

۔ مسولینی

کردار پنجم

تُرکِ دانا

سحرِ ابلیسی ہوا پھر کارگر ابنِ آدم نے سدا کھائی ہے مات
پھر بھڑک اٹھے ہیں شعلہ ہائے جنگ جل رہا ہے پھر ضمیرِ کائنات
آمریّت ہے نہ ہے جمہوریّت مغربی دنیا کے ہیں لات و منات
کیوں بچھاتے ہیں مگر مجھ پر یہ دام کیا چھُپے ہیں مجھ سے ان کے داؤ گھات
تُرکِ ناداں ہو چکا دانائے راز کھل چکے ہیں اُس پہ اسرارِ حیات
ہم نے صدیوں تک دیا اپنا لہو سرخ رُو جس سے ہے لیلائے حیات
ریگ زاروں کو بنا کر لالہ زار زندگی کو ہم نے دی شاخِ ثبات
لیکن اب اک مردِ حق کے فیض سے ہے جدا سب سے ہماری کائنات
اُس پہ سحر سامری چلتا نہیں جس کو حاصل ہوں کلیمانہ صفات

مئے بھی ہے اور مستیٔ مئے بھی ولے
مستیٔ میخوار کامل ہے ثبات

کردار ششم

لعبتِ چین ؎

رکھ لی ہے اہلِ چین نے اپنے وطن کی لاج
سوزو گداز شمعِ سے ہے انجمن کی لاج

اہلِ جفا کا آگے قدم بڑھ کے رہ گیا
دریائے ظلم خوب چڑھا، چڑھ کے رہ گیا

قوموں کی زندگی تگ و دو ہی کا نام ہے
شرطِ وجودِ بادِ بہاراں خرام ہے

ہے سوزِ سازِ دل چمن آرائے زندگی
دل بجھ گیا تو کیسی تمنائے زندگی

ہم نے دیا ہے قوم کو وہ درسِ انقلاب
لیتی ہے ظالموں سے وہ اب ظلم کا حساب

جذبہ وہ کام اہلِ تمنّا میں کر گیا
صدیوں کا زنگ اُن کے دلوں سے اتر گیا

اب جا چکا ہے نشۂ افیون چین سے
بادل نحوستوں کے گئے اس زمین سے

اب ہم وطن میں اپنے نیا دور لائیں گے
اپنا عَلَم ہمالہ سے اونچا اڑائیں گے

؎ مادام چیانگ کائی شیک

کردار ہفتم

زرگر

زر جس کے پاس ہے وہ ہے دنیا میں تاجدار
شاخ اک ہے زربدست ہے گل بے نوا ہے خار

زردار مجھ کو دیکھ کے دنیا ہے زرو رُو
ہے حاسدوں کا دل مری حشمت سے داغدار

جلتے ہیں گر تو جلتے رہیں مجھ کو دیکھ کر
وہ زرد فام راہ زنانِ خرابہ کار

شوریدہ سر کے شور سے ہوتا ہے کم کہیں
وہ اقتدار جس کی ہو بنیاد اُستوار

میں آج شرق و غرب میں ہوں میرِ کارواں
ہر شہر و کوہ و دشت میں ہیں میرے جاں نثار

وہ کج کلاہ جن کی نظر آسماں پہ تھی
کرتے ہیں طوف اب مرے کوچے کا بار بار

کل تک جنہیں وجودِ خدا میں بھی تھا سخن
آج ان کا دیکھ آگے مرے عجزو اِنکسار

رکھتا ہوں میں ہی پرچم جمہوریت بلند
اوروں کو جب گراں نظر آنے لگے یہ بار

دیتا ہوں میں ہی نوعِ بشر کو پیامِ عدل
سنتا ہوں میں ہی ملتِ مظلوم کی پکار

میرے ہی دم سے زندہ ہے آزادیٔ ضمیر
مجھ سے ہی تنگ رہتا ہے میدانِ گیرودار

بدبیں ہے وہ کہ جس کو ہو نیت پہ میری شک
مجھ پہ حرام ہے کہ میں چھپ کر کروں شکار

۔ امریکہ ۔ اہل جاپان

کردار ششم

فرنگی مشرق

غفلتِ اہلِ ایشیا باعثِ تیزیٔ فرنگ
خفتہ بزیرِ پنجہ صید، قہقہہ می زند پلنگ

حالِ زبونِ اہلِ شرق دیکھ کے جل رہا ہے دل
درد سے بھر نہ آئے کیوں دل ہی تو ہے نہ خشت و سنگ

لاتا ہوں میں نظامِ نو، دیتا ہوں میں پیامِ نو
نشہ نیا، نئی ترنگ، دور نیا، نئی امنگ

اپنی خودی میں مست ہو خود گر و خود پرست ہو
کر رہا ہے تجھے فرنگ مستِ زن و شراب و چنگ

چاہئے تجھ کو لازماً دشمن و دوست میں تمیز
جب من و تو ہوئے ہیں ایک مجھ سے ہے جنگ خود سے جنگ

ایک ہماری ابتدا، ایک ہماری انتہا
ایک ہمارا مدعا، ایک ہمارا نام و ننگ

کون ہے بحر و بر میں آج ہو سکے جو مرا حریف
دشت میں ہوں میں شیرِ نر بحر میں بے خطر نہنگ

چاہوں جدہر جدہر بڑھوں روکے کوئی یہ کیا مجال
لنک نہیں ہے پائے شوق ملکِ خدا نہیں ہے تنگ

اہلِ خرد کو پڑ گیا اہلِ جنوں سے واسطہ
گردشِ روزگار اب دیکھئے کیا دکھائے رنگ

آئیں، گرا کے دیکھ لیں بجلیاں اس کے سر پہ بھی
کر نہ سکے ہلاکِ ناز جس کو بتانِ شوخ و شنگ

ے جاپان

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

مہاتما

سا گھبرا نہ اندھیرے سے ناداں کچھ دم میں اجالا آتا ہے
پھر دیکھ کہ سورج چڑھتا ہے اور تیرا لہو گرماتا ہے

من میں وشواش کا دیپ جلا اس جیوتی سے ہردے کو جگا
پھر تیری رکھشا کے کارن دھرتی پر ایشور آتا ہے

برکھا کی سہانی رت آئی، آکاش پہ بدلی چھائی ہے
اب ہو گی ہری کھیتی تیری من اپنا کیوں کلپاتا ہے

جو شکتی ہر کے جاپ میں ہے کب تیر میں یا تلوار میں ہے
جو رام کا بان چلاتا ہے ہر ظلم کی لنکا ڈھاتا ہے

بھارت کا باسی بھولا ہے موتی کا کنکر لیتا ہے
جگ اُس کے حال پہ ہنستا ہے اور مجھ کو رونا آتا ہے

پچھم سے بادل اٹھتا ہے گھنگور گھٹا چھا جاتی ہے
میں لاکھ آشائیں رکھتا ہوں وہ بر سے بِنا اڑ جاتا ہے

اک ناری، دکھیا بے چاری، لے ہاتھ میں راکھی پھرتی ہے
کون اس کا بندھن لیتا ہے کون اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے

۔ گاندھی

مردِ مؤمن

ابھی تک ہے میری نظر میں نہاں
وہ بجلی بلیں جس سے کون و مکاں

جو شوخی نظر کے شرارے میں ہے
بھلا کب کسی برق پارے میں ہے

خرد اور جنوں ہیں مری جاں میں ضم
خلوص اور یقیں میرے ایماں میں ضم

زمانے کو مجھ سے ہمیشہ ستیز
کہ میں نغمہ ریز اور وہ فتنہ خیز

دلِ آدمی بستۂ مکر و فن
مجھے فکرِ جاں اور اسے فکرِ تن

ہلاکِ غمِ تن مسلماں بھی ہے
ہر اک کا ہے نخچیر، ناداں بھی ہے

پئے تن بلانوش اور سخت کوش
پئے تن بہ ہر روزگہ سرفروش

دریغ آں سزا وارِ شاہنشہی
پئے تن کمر بستۂ روبہی

ہوا بے بصر، بے یقیں، بے ضمیر
طلسمِ ہوا و ہوس میں اسیر

سخن ہے مرا تلخ و ناخوشگوار
مگر صاف گوئی ہے میرا شعار

نہیں مردِ حق کو خوشامد سے کام
کہ وہ نور ہے اور خوشامد ظلام

کوئی دم کا ہے اور عیش و نشاط
اجلنے کو ہے اہرمن کی بساط

یہ فرعونیت کا عذابِ الیم
دہے باش و باشد ظہورِ کلیم

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

حکمتِ بیدار

اردو زبان میں ملّی شاعری کی ایک عہد آفریں نظم

۱۹۶۲ء

کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے یہ ہفت روزہ قندیل لاہور میں بالاقساط دس شماروں میں شائع ہوئی اور مغربی پاکستان کے علاوہ مشرقی پاکستان کے ہزارہا انسانوں نے بھی اسے بڑے ذوق و شوق سے پڑھا اس کے بعد یہ نظم انجمن فیض الاسلام راولپنڈی کے انیسویں سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی۔ ملک کے نامور اہل قلم نے اسے بے حد سراہا اور جناب ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد باقر، ابوالاثر حفیظ جالندھری، محسن احسان، خلیق قریشی، عبدالعزیز فطرت، پروفیسر مرزا محمد منور، سید ضمیر جعفری اور بہت سے دیگر ارباب دانش نے اس کی بے حد تعریف کی۔

کتابی صورت میں اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور مزید ایڈیشن شائع کئے جائیں تو عوام میں ہاتھوں ہاتھ لئے جائیں۔ لہٰذا مناسب یہی سمجھا گیا کہ اپنے مجموعہ کلام میں شامل کر کے اسے مستقل طور پر محفوظ کر لیا جائے۔

نظم کا انتساب جوانانِ ملّت کے نام ہے۔

ابتدائیہ

یہ دورِ کشاکش یہ پُر آشوب زمانہ
آرام فقط نام، سکوں محض فسانہ

چھائی ہوئیں اطراف میں تاریک گھٹائیں
کجلائی ہوئیں وقت کی بے نور فضائیں

افکار پہ منڈلاتے ہوئے یاس کے بادل
برساتے ہوئے تلخیاں احساس کے بادل

چہرے کہ ہیں جھلسے ہوئے افلاس کی لُو سے
خالی نظر آتے ہیں مسرت کے لہو سے

جھلسے ہوئے چہروں پہ ہیں مایوس نگاہیں
مایوس نگاہوں میں چھلکتی ہوئی آہیں

دل ولولہ و جوش و حرارت سے ہیں محروم
یہ آئنے انوارِ محبّت سے ہیں محروم

ماحول پہ اک کیفیّتِ کرب ہے طاری
خونابۂ غم دیدۂ حسرت سے ہے جاری

حالات کی دہلیز پہ سر پھوڑتے انساں
افلاس کی آغوش میں دم توڑتے انساں

افلاکِ مقدّر پہ دگرگوں ہیں نظارے
گردش میں ہیں جتنے نظر آتے ہیں ستارے

ماضی کے دھندلکوں میں ہے گم حال کی تصویر
تقدیر کے زانو پہ ہے سوئی ہوئی تدبیر

☆ ☆ ☆

آئینۂ ماضی

ہے آج یہ اس قوم کا آئینۂ احوال
جس قوم کا اقبال ہے تاریخ کا اقبال

جس قوم نے بخشے ہیں زمانے کو خط و خال
ہے جس کا لہو غازۂ رخسارِ مہ و سال

جس قوم نے انسان کی عظمت کو ابھارا
چمکایا زمانے کے مقدّر کا ستارا

جس قوم نے آئینۂ ہستی کو جِلا دی
اُجڑی ہوئی دنیا کو نئی آب و ہوا دی

ہر روحِ فسردہ کو تب و تاب عطا کی
ہر سازِ دلِ مُردہ کو مضراب عطا کی

ہر شعلہ نم خوردہ کو بے باک بنایا
ہر آہوئے رم پیشہ کو چالاک بنایا

افتادہ سر خاک جو تھے ان کو اٹھایا
انسان کو پیغامِ مساوات سنایا

تاریک ہوئے جب بھی کبھی یاس کے سائے
امّید کے کچھ تازہ چراغ اِس نے جلائے

یہ قوم تو آغوش حوادث میں پلی ہے
یہ شمع سدا باد مخالف میں جلی ہے

ڈوبی ہے تو اس شان سے ابھری ہے' دوبارا
طوفان نے بھی شرما کے کیا اس سے کنارا

جب بھی ہوئی اس قوم پہ حالات کی یلغار
خوابیدہ صلاحیتیں اس کی ہوئیں بیدار

یہ قوم اگر بے سرو ساماں بھی رہی ہے
سرمایۂ صد نازشِ دوراں ہی رہی ہے

ہر دور میں باطل سے رہی بر سرِ پیکار
ہر دور میں ثابت ہوئی اللہ کی تلوار

ہو یا کہ نہ ہو ساغر و پیمانہ میسّر
اس قوم کو ہے جرأتِ رندانہ میسّر

کل کا ہے ابھی ذکر کہ اس قوم نے اٹھ کر
حالات کے دھارے کو بدل ڈالا تھا یکسر

تاریخ کے اوراق پہ لکھا وہ فسانہ
بھولے گا نہ تا روزِ ابد جس کو زمانہ

آئینۂ حیرت ہوئی ہر چشمِ تماشا
اس قوم نے جب ایک نیا ملک تراشا

سرمایۂ دولت تھا نہ پیرایۂ تنظیم
انگشتِ سیاست سے کیا ہند کو دو نیم

تاثیر کھلی بندۂ مؤمن کی نظر کی
تصدیق ہوئی معجزۂ شقِّ قمر کی

☆ ☆ ☆

بندۂ مؤمن

ہر شخص کی پہچان کا دنیا میں ہے معیار
مومن کی ہے پہچان کہ ہو صاحبِ کردار

مؤمن تو بہ ہر رنگ ہے اِک جلوۂ معنی
پنہاں ہو تو جوہر ہے عیاں ہو تو ہے تلوار

جزؤ کشمکشِ شوق نہیں زیست کا خواہاں
ساحل سے گریزاں ہے تلاطم کا خریدار

سر اپنا جھکاتا نہیں چوکھٹ پہ کسی کی
ہر دور میں ہے عظمتِ آدم کا نگہدار

ہے حکمتِ کافر سے الگ حکمتِ مؤمن
یہ سادہ و بیدار ہے وہ پُر فن و پُرکار

☆ ☆ ☆

تاسیسِ پاکستان

اس حکمتِ بیدار کا حاصل یہ وطن تھا
طوفانِ بلا خیز کا ساحل یہ وطن تھا

یہ قوم کے افکار کا پُر نور سویرا
یہ ملّتِ بیضاء کی امنگوں کا بسیرا

یہ جنّتِ تخیّل یہ فردوس تصوّر
یہ ارضِ مباہات یہ دنیائے تفاخر

یہ اپنی تمنّاؤں کا میدان تگ و تاز
یہ دل کی تڑپ، جاں کی صدا، روح کی آواز

یہ سوز و تب و تاب کی منہ بولتی تصویر
یہ صفحۂ تاریخ پہ احساس کی تحریر

یہ وقت کے ماتھے پہ نشاں حسنِ وفا کا
یہ دامنِ تدبیر میں انعام خدا کا

اس دور کی تاریخ کا رنگین فسانہ
اسلام کی عظمت کا یہ مضبوط ٹھکانہ

☆ ☆ ☆

پاکستان ورچوئل لائبریری

شکستِ خواب

ہے غرق تحیّر میں مگر ملّتِ سادہ
ساحل پہ یہاں اٹھتے ہیں طوفان زیادہ

وہ خواب کہ تھا معنیٔ بیدار کی تفسیر
اس خواب کی آتی ہے نظر اور ہی تعبیر

اس خاک کا جو ذرّہ ہے پامالِ ہوس ہے
ہر کُنجِ چمن بے در و دیوارِ قفس ہے

چھائی ہوئی بدکار بد اطوار سیاست
اندیشۂ بیمار کی بیمار سیاست

یہ قوم کے رہبر، یہ سیاست کے دُلارے
یہ پھولوں کی مانند تروتازہ شرارے

یہ وقت کی رفتار کے پہچاننے والے
ہر رنگ میں تقریر کا گر جاننے والے

سرمستِ سیاست ہیں سیاست کے مداری
قوم ان کی بلا سے جو ہو اللہ کو پیاری

ہے فکر غلط کوش، تخیّل غلط اندیش
ہمّت میں تذبذب ہے ارادوں میں پس و پیش

ملت ہے کہ نیرنگیٔ افراد میں گم ہے
قطروں کی اَنا البحر سے حیرت زدہ خم ہے

آویزشِ امواج سے دریا متحیّر
ذرّوں کی تگ و تاز سے صحرا متحیّر

ہے نقطہ پُرکارِ عمل ذات فقط ذات
اس دائرۂ تنگ میں کیا بدلیں گے اوقات

کچھ بڑھ کے سیاست سے ہے بازارِ تجارت
اخلاق کی ہر قدر یہاں ہوتی ہے غارت

بازار یہی کہئے تو ہے یہ لوٹ کا بازار
سودے ہیں امانت کے دیانت کے ہیں بیوپار

بیٹھے ہوئے ہر موڑ پہ خوش وضع لٹیرے
یہ مار سرِگنج، یہ چالاک سپیرے

یہ لکشمی دیوی کے مسلمان پجاری
اخلاق سے احساس سے ایمان سے عاری

بھوک اور بڑھی، یاروں کا دل اور بڑھا ہے
دام اور چڑھے، نشّہ اِنہیں اور چڑھا ہے

یہ قحط میں اک فصلِ گراں کاٹنے والے
حالات کے ماروں کا لہو چاٹنے والے

دم ان کا سلامت ہے تو ہے امن و سکوں خواب
یہ لوگ ہیں موجود تو ہر چیز ہے نایاب

جس قوم کا سرمایہ تھا توحید کی مستی
آج اُس پہ مسلّط ہوئی سرمایہ پرستی

اس شان سے سرمائے کا ابُھرا ہے سفینہ
اک موجِ سبک سیر ہے محنت کا پسینہ

ماحول میں ابُھرے ہیں کئی شوخ ستارے۔
چاندی کی گھٹاؤں کے حسیں صاعقہ پارے

یہ آتش و آہن کے نئے راج دلارے
یہ قوّتِ سرمایہ کے چڑھتے ہوئے دھارے

یہ ساختہ پُرداختۂ برق و بخارات
ہیں مردہ مشینوں کی یہ سب زندہ کرامات

یہ قوم کی دولت کے خدایانِ مجازی
صنعت کو بنائے ہوئے اک کیمیا سازی

ان کی ہوس زر کا ٹھکانا ہی کہاں ہے
زر جیسے اِنہی کا ہے زمانے میں جہاں ہے

قوم ان کے لئے زر کی ہے اعداد نمائی ؎
فرد ان کی نظر میں ہے منافع کی اکائی ؎

دولت ہے کہ سمٹی چلی آتی ہے برابر
لالچ ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے برابر

☆ ☆ ☆

؎ سرمایہ دار صنعت کار ؎ *Statistics* ؎ *Unit of Profit*

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

دولت کی دوڑ

اک دوڑ ہے دولت کے لئے ملک میں جاری
ہر شخص نظر آتا ہے دولت کا پجاری

دولت ہی بنی قبلہ بھی اور قبلہ نما بھی
معبود بھی مسجود بھی ہے بلکہ خدا بھی

ہیں طفل و زن و پیر و جواں اس کے پرستار
فکر و عمل و قلب و زباں اس کے گرفتار

ہر ذہن میں پیدا ہوئے زرخیز ارادے
پہنے ہوئے حیلوں کے دلاویز لبادے

ہیں عام بہت مکر و دغا، حیلہ و تزویر
ناپاک مقاصد کی ہیں ناپاک تدابیر

اِک زہر ہوّس کاری و مقصود برآری
مِلّت کی رگ و پَے میں ہوا جاری و ساری

عِفّت ہوئی تاراج تو غیرت ہوئی غارت
ہر جذبۂ پاکیزہ بنا جنسِ تجارت

باقی ہے کسی دل میں امانت نہ دیانت
ملتی ہے جدھر جائیں خیانت ہی خیانت

ہر فتنۂ خفتہ ہوسِ زر سے ہے بیدار
ہر سمت دنائت کی ہوئی گرمیٔ بازار

ہر مملکت دل پہ خیانت کی ہے شاہی
ہر چہرے پہ تابندہ ہے رشوت کی سیاہی

باقی ہے کہاں ولولۂ گرمیٔ کردار
رشوت طلبی ہے عملِ قوم کا معیار

مفلس پہ ہوئے عدل و مساوات کے در بند
قانون ہے دولت کے کٹہرے میں نظر بند

رشوت کا کراں تابہ کراں سکہ رواں ہے
نادار کہاں جائیں کہ انصاف گراں ہے

☆ ☆ ☆

جب قوم کا ہر شخص ہو بالطّبع لٹیرا
ہر دل میں ہو ناپاک امنگوں کا بسیرا

ہر ایک یہی چاہے کہ ہو لوٹنے والا
نادار پہ بجلی کی طرح ٹوٹنے والا

ہر شخص ہو جب گُرگِ جفا پیشہ و خونخوار
کمزور پہ ہر آن جھپٹ پڑنے کو تیار

ہر دل میں محبت ہو اگر دام و درم کی
ہر ذہن پہ تصویر ہو چاندی کے صنم کی

ہر ولولہ ہو جائے گرفتارِ زر و مال
ہر حوصلہ ہو حرص کے پاؤں تلے پامال

دولت پہ ہو موقوف جب انساں کی بڑائی
سرمائے کی ہر سمت نظر آئے خدائی

زردار جب اشراف ہوں نادار ہوں عامی
بنکوں کی سند سے ہوں جب انسان گرامی

دولت ہی شرافت ہو غریبی ہی رذالت
انساں کا ہو معیار فقط ظاہری حالت

جب قوم میں اس طرح ابھرنے لگیں طبقات
جزابلہ فریبی نہیں ، تلقینِ مساوات

اِک طبقۂ نادار ہو اک طبقۂ زردار
کس منہ سے اخوّت کا کرے گا کوئی پرچار

ہو جائے جب احساس مساوات ہی نابود
ہو جاتا ہے پھر مقصدِ انصاف بھی محدود

گدلاتا ہے سر چشمۂ آئینِ عدالت
آجاتا ہے افکار میں اندازِ جہالت

چھا جاتی ہیں ذہنوں پہ تعصّب کی گھٹائیں
ہو جاتی ہیں تاریک زمانے کی فضائیں

ہو جاتے ہیں گم عدل کے پر نور ستارے
مظلوم، ستم دیدہ غریبوں کے سہارے

☆ ☆ ☆

عدل و انصاف

اس دہر میں ہے عدل پہ اقوام کی بنیاد
جس قوم میں ہو عدل وہی قوم ہے آباد

جس ملک میں انصاف کا آئین ہو جاری
اُس ملک میں چلتی ہے سدا بادِ بہاری

ہوتے نہیں اُس ملک میں غدّار برومند
کھلُ کھیلنے پاتے نہیں شیطان کے فرزند

کہتا ہے یہ اک چین کا دانائے یگانہ ؎
"جب عادل و منصف ہوں خدایانِ زمانہ

ہر سختیٔ حالات کو سہ سکتے ہیں انسان
شیروں کی کچھاروں میں بھی رہ سکتے ہیں انسان"

جس قوم سے چھن جاتا ہے دستور عدالت
بنتی نہیں اس قوم کی بگڑی ہوئی حالت

؎ کنفیوشس

یہ بات پیمبرؐ کی خطا ہو نہیں سکتی
"جز عدل حکومت کو بقا ہو نہیں سکتی

عادل ہو تو کافر کی بھی رہ سکتی ہے شاہی
ظالم ہو تو مُومن کی حکومت بھی تباہی"

اے مسلِم کم دیدہ و خوابیدہ و مدہوش
افسوس کہ یہ نکتہ ہوا تجھ کو فراموش

اسلام نہیں رسم و روایات کا مذہب
اسلام تو ہے عدل و مساوات کا مذہب

مقبول ہیں ہر چند عبادات بھی ساری
اللہ کو مخلوق مگر ان سے ہے پیاری

مخلوق سے جس ملک میں انصاف نہیں ہے
خالق کا وہاں سایۂ الطاف نہیں ہے

انصاف ہی سر چشمۂ حُبّ الوطنی ہے
انصاف کی بنیاد پہ ہر قوم بنی ہے

ؐ الملک یبقی مع الکفر ولا یبقی مع الظلم (حدیث رسول)

اس چہرۂ روشن پہ جو آجائے سیاہی
ہر صبح قیامت ہے تو ہر شام تباہی

دھندلاتا ہے اس طرح سے آئینۂ افکار
آتی ہے نظر اور ہی کچھ صورتِ کردار

ہو عدل میسّر تو ہے ہر شخص فدائی
بے سود ہے ورنہ وطنیّت کی دُہائی

مایوس نظر نعروں سے کب ہوتی ہے خورسند
ٹوٹے ہوئے دل خاک سے کب ہوتے ہیں پیوند

ہے خاک کا رشتہ بھی بڑی چیز جہاں میں
اس رشتے سے آتی ہے حرارت دل و جاں میں

اک برقِ تپاں ولولۂ حبِّ وطن ہے
اِس برق سے پُر نور ارادوں کا چمن ہے

اس سے بھی مگر بڑھ کے ہے ایماں کی حرارت
ہے جذبۂ ایماں سے دل و جاں کی حرارت

گرماتا ہے جب اس سے لہو پیر و جواں کا
رہتا نہیں کچھ ہوش کسی کو دل و جاں کا

تج دیتے ہیں دولت بھی محبت بھی وطن بھی
ہر رشتۂ دیرینہ بھی ہر یاد کہن بھی

گھر بار لٹا دیتے ہیں اور لعل و گہر بھی
کیا چیز ہے گھر بار کہ دے دیتے ہیں سر بھی

کہتے ہیں جسے جذبۂ بیدار یہی ہے
قوموں کے لئے قافلہ سالار یہی ہے

☆ ☆ ☆

جذبہ ایمان

ہر جذبہ صادق سے بدل جاتے ہیں انسان
ہر جذبۂ سے محکم ہے مگر جذبۂ ایمان

اس جذبہ سے ہوتی ہے خودی سینوں میں بیدار
یہ جذبہ گداؤں کو بنا دیتا ہے سلطان

ہے فیض اسی جذبہ کا وہ بارشِ انوار
جس بارشِ انوار سے دُھل جاتے ہیں اذہان

یہ خاک کا پتلا کہ جسے کہتے ہیں آدم
بنتا ہے اِسی نورُ سے اللہ کی برہان

یہ جذبہ ہے افراد کی قوّت کا محافظ
یہ جذبہ ہے اقوام کی عظمت کا نگہبان

وہ قوم زمانے میں کبھی مٹ نہیں سکتی
جو قوم بناتی ہے اسے زیست کا عنوان

☆ ☆ ☆

زوالِ جذبۂ ایمان

اس دور میں یہ جذبہ مگر سرد ہوا ہے
رنگِ رخِ اربابِ حرم زرد ہوا ہے

مذہب سے ہوا جاتا ہے بیگانہ مسلماں
مغرب کی تجلی کا ہے پروانہ مسلماں

ہے لب پہ ابھی نغمۂ توحید تو جاری
دل ہے مگر اصنامِ فرنگی کا پجاری

نعرے تو ہیں آئینِ محمدؐ کے زباں پر
نظریں ہیں مگر مصلحتِ سُود و زیاں پر

ظاہر میں تو ہے عظمتِ قرآں کا طلب گار
باطن میں ہے مغرب کے اصولوں کا پرستار

ہے زینت گفتار تو قانون خدا کا
کردار پہ ہے خول مگر مکر و ریا کا

دل اور زبان اور، عمل اور بیان اور
گفتار کا رنگ اور ہے کردار کی شان اور

کچھ ایسی مسلّط ہوئی تاریکیٔ افکار
مغرب کو سمجھنے لگا سرچشمۂ انوار

یہ قوم کہ حکمت میں تھی خورشید جہاں تاب
اب ہے کسی پرتو کے لئے دیدۂ بے خواب

دامن میں ہے گو حکمت و عرفاں کا خزینہ
چہرے سے ٹپکتا ہے ندامت کا پسینہ

کرتی ہے بصد ذلّتِ بے برگ و نوائی
مشرق کی گدائی کبھی مغرب کی گدائی

گلشن بکناروں کی بگولوں پہ نظر ہے
ہر بات میں غیروں کے اصولوں پہ نظر ہے

مطلوب کچھ ایسا ہوا اوروں کا قرینہ
اپنے کسی انداز سے مرنا ہے نہ جینا

مانگے کی سیاست بھی ہے حکمت بھی بیاں بھی
کچھ اور تو کیا ہو کہ نہیں اپنی زباں بھی

بے مثل جو افلاسِ تفکّر ہے ہمارا
اغیار کی تقلید تفاخر ہے ہمارا

اپنا تو سفینہ ہے نہ دریا نہ کنارے
چلتے تو ہیں ہم بھی مگر اوروں کے سہارے

جوانانِ ملّت

مذہب سے یہ بیگانگی اللہ بچائے
ہنستے ہیں ہمیں دیکھ کے سب اپنے پرائے

اب تک تو عمل ہی سے تھا بیگانہ مسلماں
افکار بھی ہونے لگے اب اس کے پریشاں

جاتا ہوا آتا ہے نظر حسنِ بیاں بھی
گم شعلۂ دل بھی ہے تو ہونٹوں کا دھواں بھی

لائی ہے عجب رنگ حریصانۂ تگ و تاز
بے ڈھب نظر آتے ہیں نئی پود کے انداز

وہ قوم کا گنجینہ، وہ سرمایۂ ملّت
یعنی وہ جوانانِ گہر مایۂ ملّت

ہونا تھا جنہیں پیکرِ سرمستیٔ کردار
بننا تھا جنہیں قوم کی تقدیر کا معمار

افلاک سے ہونا تھا جنہیں برسرِ پیکار
کرنا تھا جنہیں وقت کی نبضوں کو گرفتار

آتے ہیں نظر ولولۂ شوق سے خالی
احساس پہ طاری ہے پراگندہ خیالی

افکار پریشان، خیالات پریشان
پھرتے ہیں بھٹکتے ہوئے دن رات پریشان

دل میں نہ کوئی جوش نہ مقصد نہ ارادہ
بے رنگِ عمل زیست ہے اِک نسخۂ سادہ

ذہنوں میں اُبلتے ہوئے رنگین فسانے
ہونٹوں پہ مچلتے ہوئے فلموں کے ترانے

دلدادۂ خواب و خورش و گرمیٔ گفتار
محنت سے گریزاں طلب و سعی سے بیزار

آرام طلب نغمہ سرا ان کی جوانی
دنیا کو ہیں سمجھے ہوئے اک رام کہانی

ہے قوم تو دامِ ہوسِ زر میں گرفتار
لٹتی ہے مگر قوم کی دولت سرِ بازار

اے اہلِ نظر خیر جوانوں کی مناؤ
لٹتی ہوئی اس دولتِ فردا کو بچاؤ

☆ ☆ ☆

علم و دانش

ہے اس کی حفاظت کا مگر ایک ہی عنوان
علم اس کا نگہدار ہو عقل اس کی نگہبان

کیا خوب ہے یہ نکتۂ فردوسیٔ دانا
ہو سکتا ہے دانا ہی زمانے میں توانا

دانش کا نتیجہ ہے توانائی جہاں میں
جاہل کے مقدّر میں ہے رسوائی جہاں میں

دنیا میں وہی لوگ ترقی کے ہیں حقدار
رہتے ہیں شب و روز جو دانش کے پرستار

؎ توانا بود ہر کہ دانا بود ۔ فردوسی

ہے عِلم ہی پیرایۂ تکریم و شرافت
آدم کو ملی عِلم کی دولت سے خلافت

وہ خاک جو موتی ہے نہ زر ہے نہ گہر ہے
وہ علم کی دولت سے ہی مقصودِ نظر ہے

ہے گرچہ کفِ خاک سے انسان کی تعمیر
علم اس میں جو مل جائے تو بن جاتا ہے اکسیر

انسان کی عظمت ہے اِسی علم کا اعجاز
جز علم نہیں کوئی بھی سرمایۂ اعزاز

سینے ہیں جو آئینۂ عِرفاں تو اِسی سے
ہیں خاک کے ذرّے مہ تاباں تو اِسی سے

ہوتے ہیں اگر ذہن پر انوار تو اِس سے
کھلتے ہیں جو تقدیر کے اسرار تو اِس سے

مِٹّی اِسی جادو سے اگلتی ہے خزینے
چلتے ہیں اِسی سحر سے خشکی پہ سفینے

ہے خاکِ فسردہ میں تب و تاب اِسی سے
بنتے ہیں خزف گوہرِ نایاب اِسی سے

دنیا میں ہے سرمایہ عظمت تو یہی ہے
عقبیٰ میں جو ہے باعثِ عزت تو یہی ہے

انسان کا جز علم نہیں کوئی ٹھکانا
ہے عِلم سے غفلت ہی تنزل کا بہانہ

☆ ☆ ☆

دولت، حکومت، علم

دولت نہ حکومت نہ امارت ہے بڑی چیز
دنیا میں مگر دانش و حکمت ہے بڑی چیز

جس دل میں ہو دولت کا جنوں محوِ تگ و تاز
دب جاتی ہے اُس میں حق و انصاف کی آواز

دولت کے پجاری تو ہیں قارون کے فرزند
مرتے نہیں قارون کے ترکے پہ ہنر مند

ہے شیوۂ فرعون حکومت پہ تفاخر
زیبا نہیں مؤمن کو یہ ملبوسِ تکبّر

دو دن سے زیادہ نہیں شاہی کا فسانہ
ہر روز ورق تازہ الٹتا ہے زمانہ

اس دہر میں گزرے ہیں بہت صاحبِ اقبال
تھا حد سے فزوں جن کا زمانے میں فروفال

نمرود بھی شدّاد بھی، ہامان بھی گزرے
جمشید بھی، فغفور بھی خاقان بھی گزرے

ہم ان کے نہ وارث ہیں نہ پیرو نہ ثنا خواں
ہم لوگ تو ہیں خاکِ رہِ صاحبِ قرآں

دی علم کو اس صاحبِ قرآں نے یہ توقیر
امّت سے یہ فرمایا کہ یہ ہے تری جاگیر

صد حیف اگر آج ہو دولت ہمیں پیاری
اے قوم فقط علم تھی میراث ہماری

☆ ☆ ☆

احوال علم

بدلے ہیں کچھ اس طرح مگر علم کے احوال
تاریک نظر آتے ہیں فردا کے خط و خال

یہ چشمۂ پاکیزہ بھی گدلایا ہوا ہے
افسوس کہ یہ چاند بھی گہنایا ہوا ہے

اب علم بھی ہے ایک متاعِ سرِ بازار
چاندی ہو تو مل سکتے ہیں اس چاند کے انوار

بدلا ہے اس انداز سے پیمانۂ تعلیم
افسانۂ زر بن گیا افسانۂ تعلیم

بجتا ہے زر و سیم سے اب علم کا بازار
کرتے ہیں بصد یاس نگہ دُور سے نادار

اک عُقدہ ہے یہ عقدہ کشایانِ جہاں تک
دولت پہ ذہانت کی ہے بنیاد کہاں تک

کس طرح سے آئے گی سرِ کار ذہانت
روتی رہی گلیوں میں جو نادار ذہانت

اے واقفِ اسرارِ نہاں خانۂ اسلام
اسلام کا مقصد ہے کہ ہو علم کی مئے عام

جب تک کہ مئے علم یہاں عام نہ ہو گی
سرسبز کبھی مِلّتِ اسلام نہ ہو گی

☆ ☆ ☆

اب تک تو مئے علم ہے محدود ہی محدود
آزادیٔ افکار ہے مسدود ہی مسدود

مسدود نہ ہوتی رہِ آزادیٔ افکار
ذہنوں پہ مسلّط ہے مگر دانشِ اغیار

کچھ غور جو کیجے تو یہ دانش بھی کہاں ہے
احساس پہ چھائی ہوئی غیروں کی زباں ہے

ظاہر ہے کہ پہنچے گی نظر اُن کی کہاں تک
جو علم کو محدود سمجھتے ہیں زباں تک

آئے گی تو کیا اس سے بھلا دانش عالی
ہاں فیض اسی کا ہے پراگندہ خیالی

ہوتے ہیں جہاں قلب و نظر غیر کی اقلیم
پلتے ہیں وہاں ذہنوں میں نخوّت کے جراثیم

سینوں میں تکبّر کے ابل پڑتے ہیں دھارے
نظروں سے لپکتے ہیں حقارت کے شرارے

کرتی ہے رگ و پے میں سرایت مئے پندار
گفتار بدل جاتی ہے کھو جاتا ہے کردار

چھن جاتا ہے احساس بھی، غیرت بھی ہنر بھی
لٹ جاتی ہے پاکیزگیٔ قلب و نظر بھی

کٹتی ہیں ملل جس سے وہ تلوار یہی ہے
بٹتی ہیں اُمَم جس سے وہ دیوار یہی ہے

اپنوں سے ہے اظہارِ تنفّر تو اسی سے
غیروں کی روِش پر ہے تفاخر تو اِسی سے

رہتا نہیں جب اپنی زباں ہی سے سروکار
کیا اس میں تعجب ہے جو اپنے لگیں اغیار

جب اپنی روایات نہ مسلک پہ نظر ہو
تاریخ نہ مذہب نہ سیاست کی خبر ہو

آبا کے نہ کردار نہ غیرت کا اثر ہو
کچھ اپنے خدا کی نہ پیمبر کی خبر ہو

پھر قوم میں ہو وحدتِ افکار تو کیوں کر
ملّت ہو بلندی کی سزاوار تو کیوں کر

☆ ☆ ☆

اساسِ ملّتِ اسلام

ہر قوم کا اس دہر میں کردار جدا ہے
ہر قوم کے کردار کا معیار جدا ہے

بنیاد کسی قوم کی ہے حُبِّ وطن پر
ناموسِ وطن اس کو ہے ہر چیز سے بڑھ کر

ہے نسل کے پھندوں میں گرفتار کوئی قوم
تقدیسِ زباں کی ہے پرستار کوئی قوم

اک قوم کی تہذیب و تمدن پہ ہے بنیاد
اک قوم ہے آئین و قوانین کی ایجاد

اسلاف کی عظمت ہے کسی قوم کا محور
آئینِ سیاست ہے کسی قوم کا محور

کچھ قومیں ہیں آبا کی حکایات کی تخلیق
کچھ قومیں ہیں دیرینہ روایات کی تخلیق

ان سب سے مگر ملّتِ اسلام جدا ہے
مقصود جدا اس کا ہے پیغام جدا ہے

فطرت سے سدا اس کی ہم آہنگیٔ مقصود
فطرت کا ہے مقصود کہ انساں کی ہو بہبود

انسان کی بہبود ہے پیغامِ محمدؐ
ہے عظمتِ انساں کا امیں نامِ محمدؐ

کب نام کے قابل تھا کوئی کام ہمارا
اس نام سے باقی ہے مگر نام ہمارا

وہ صاحبِ کونین ، وہ مولائے مسلماں
دنیا میں بھی عقبیٰ میں بھی ماوائے مسلماں

آقا وہی، مالک وہی مختار وہی ہے
اُمّت کے لئے چشمۂ انوار وہی ہے

جو اُس کے ہوئے اُن سا زمانے میں نہیں ہے
جو اُس کے نہیں اُن کی نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

غیروں کے لئے بابِ عنایات در اس کا
اپنوں کے لئے قبلۂ حاجات در اس کا

اے امّتِ گم گشتہ اسی در پہ پہنچ جا
جینا ہے تو پھر زیست کے محور پہ پہنچ جا

اس در پہ ترا غنچۂ امید کھلے گا
جو کچھ بھی ملے گا تجھے اُس در سے ملے گا

اس در کے غلاموں میں سکندر بھی ہیں جم بھی
اک خاک نشیں بندہ ناچیز کرمؔ بھی

پہنچا ہے جو بن کر در اقدس پہ سوالی
کرتا ہے مناجات بہ پیرایۂ حالیؔ

☆ ☆ ☆

مناجات

امت تری بے طرح گرفتارِ بلا ہے
"اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے"

بچ نکلا تھا طوفاں سے تو خیر اپنا سفینہ
ساحل پہ جو پہنچے ہیں تو دل ڈوب رہا ہے

ایمان کی دولت تھی غلامی میں سلامت
آزاد ہوئے ہیں تو یہ سرمایہ لٹا ہے

رغبت سے کبھی سر بھی نہ جھکتا تھا ہمارا
لیکن درِ اغیار پہ ادب دل بھی جھکا ہے

وہ برق جو ہر دور میں گرتی رہی ہم پر
اب روشنیٔ قلب و نظر اس کی ضیا ہے

کرتے رہے صدیوں ہمیں برباد جو صیّاد
اب اپنے گلستاں میں فقط اُن کی ہوا ہے

اے سرورِ کونین ! امیں تیرا لقب تھا
صد پارہ مگر اپنی امانت کی قبا ہے

اے اسود و احمر کو بہم جوڑنے والے
اُمّت کا ہے یہ حال کہ ایک اِک سے جُدا ہے

رسوائے زمانہ ہوئی اب مِلّتِ بیضاء
اخلاق نہ کردار نہ احساس رہا ہے

غیروں سے کہاں مہر و مروت کی ہے توفیق
اپنوں سے بھی اخلاص نہ الفت نہ وفا ہے

یہ قوم کہ تھی عدل و مساوات میں یکتا
ہر قوم سے اب ظلم و تعدی میں سوا ہے

محروم نہیں گرچہ زر و مالِ جہاں سے
افلاسِ تفکّر سے غریبُ الغربا ہے

دامن میں ہیں جو پھول نہیں ان سے تو آگاہ
غیروں کے خس و خار میں دل اس کا لگا ہے

شاہا ! ہمیں پھر بخش وہ توقیعِ غلامی

شاہی سے فضیلت میں جو سو بار سوا ہے

آقا ! ہمیں اپنے درِ رحمت سے عطا کر
وہ خاک حقیقت میں جو اکسیرِ شفا ہے

داتا ! ہمیں پھر دے وہ بصیرت کا خزینہ
کھویا ہے جسے ہم نے تو یہ حال ہوا ہے

اے صاحبِ لولاک ! نظر سوئے کرم بھی
جو خستہ و دل ریش ترے در پہ کھڑا ہے

احساس میں آیا ہوا شدت کا تلاطم
سینے میں غم و درد کا طوفان بپا ہے

وہ کربِ سخن میں ہے کہ ہر لفظ میں اس کے
محسوس یہ ہوتا ہے کہ دل پھوٹ بہا ہے

آہیں ہیں کہ تپتے ہوئے صحرا کی ہوائیں
آنسو ہیں کہ اک چشمۂ خونِ شہدا ر ہے

اپنے لئے لیکن نہ کوئی آہ نہ آنسو
یہ سوز و تپش سب غمِ ملّت کی عطا ہے

اب تو ہو نظر ہم پہ کہ اے شافعِ محشر
بن اس کے ہمارے لئے اک حشر بپا ہے